تعلیم و تربیت
جنوری 1989ء
1989
نیا سال مُبارک

اڑتالیسواں سال - دسواں شمارہ

ماہنامہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر : عبدالسلام

ایڈیٹر : ظہیر سلام

سینیئر اسسٹنٹ ایڈیٹرز : سید لخت - مقبول انور داؤدی - ڈاکٹر عبدالرؤف

اسسٹنٹ ایڈیٹر : سیماں علی

آرٹ ڈائریکٹر : محمود حسن رُومی

سرکولیشن منیجر : الطاف احمد

ایڈورٹائزنگ منیجر : مبشر علی خان

ڈسٹری بیوشن منیجر : شہزاد اصغر

اکاؤنٹس منیجر : محمد انور بھٹی

جنرل منیجر پروڈکشن : ایم جاوید خان

منیجر پلاننگ : فاروق عالم

سرکولیشن اسسٹنٹ : محمد اشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پبلشر : ظہیر سلام

پرنٹر : عبدالسلام

شعبہ ادارت و اشتہارات

۳۲- شارع بن بادیس (ایمپرس روڈ) لاہور

فون :- 63090-226819

سرکولیشن اور اکاؤنٹس

۶۰- شاہراہ قائداعظمؒ لاہور

فون :- 301196-97

راولپنڈی آفس

۲۷۷- پشاور روڈ

فون :- 63503-64273

کراچی آفس

مہران ہائٹس - مین کلفٹن روڈ

فون :- 537730

جنوری 1989

قیمت فی پرچہ =/8 روپے

سرورق : نیا سال

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیمؕ

السّلام علیکُم

نیا سال مُبارک

خُدا کرے یہ سال آپ کے لیے بلکہ پُوری دُنیا کے لیے امن و آشتی، خوش حالی اور شادمانی کا پیغام لے کر آئے۔

ہمیں خُوشی ہے کہ آپ نے ہمارا نیا سِلسلہ "ہونہار مُصوّر" بہت پسند کیا۔ بے شمار ہونہار مُصوّروں نے ہمیں پیاری پیاری تصویریں بنا کر بھیجی ہیں۔ لیکن بھئی بعض بچّوں نے ہماری ہدایات یا تو پڑھی نہیں یا جان بُوجھ کر اُن پر عمل نہیں کیا۔

ہم نے تاکید کی تھی کہ تصویر رنگین اور تعلیم و تربیت کے آدھے صفحے کے برابر ہونی چاہیے۔ اُس کے نیچے اپنا نام، عُمر، کلاس اور پُورا پتا لکھیے، اور اپنے سکول کے پرنسپل، ہیڈ ماسٹر یا ہیڈ مسٹریس سے یہ تصدیق ضرور کرائیے کہ تصویر آپ ہی نے بنائی ہے۔ بعض بچّوں نے سائز کا خیال نہیں رکھا اور بعض نے سکول کے سربراہ سے تصدیق نہیں کروائی۔ خیر! اس دفعہ تو ہم نے اُن کی تصویریں مقابلے میں شامل کر لی ہیں، لیکن آیندہ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔ اُمید ہے ہونہار مصوّر ہماری ہدایات پر عمل کریں گے۔

ایڈیٹر

فہرست مضامین

نیا سال

ناصر زیدی

نیا سال خوشیوں کا پیغام بر ہے
نئے سال پر کُل جہاں کی نظر ہے

ہر اِک کی زباں پر یہی اب دُعا ہے
ہر اِک شخص کی بس یہی اِلتجا ہے

نیا سال سب کو ہی خوشیاں دکھائے
خزاں اِس چمن پر کبھی آ نہ پائے

کریں کام ایسے کہ دُنیا ہو حیراں
وطن کی ہو عظمت اِسی سے نمایاں

جو بچھڑے ہوں، آپس میں وہ مِل سکیں پھر
شگوفے محبّت کے یُوں کِھل سکیں پھر

اُخوّت، محبّت ہو ایمان اپنا
وطن سے بنے نام ذی شان اپنا

ہمارے ہی دَم سے ہو عظمت وطن کی
ہمیں سے بڑھے آبرو اِس چمن کی

تین انوکھے ساتھی

سیماں کمال صوفی

گُل محمّد کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہرا بھرا اور خوب صورت۔ لیکن یہاں کے لوگ بہت غریب تھے، اِتنے غریب کہ اُنھیں پیٹ بھر کر کھانا بھی مشکل سے ملتا تھا۔ گُل محمّد بہت عقل مند اور ذہین نوجوان تھا۔ اُسے اِس بات کا بہت رنج تھا کہ گاؤں کے لوگ اِتنے غریب ہیں۔ وہ سوچتا کہ اُس کی عقل مندی اور ذہانت کِس کام کی، جو گاؤں کے لوگوں کی غربت بھی دُور نہیں کر سکتی۔ وہ بھیڑیں چَراتے جنگل میں جاتا تو بس یہی سب کچھ سوچتا رہتا۔

ایک روز اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ شہر جا کر اپنی عقل مندی اور ذہانت سے دولت کمائے۔ چُناں چہ اگلی صُبح وہ والدین سے اِجازت لے کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا، جو گاؤں سے بہت دُور تھا۔ وہ رات کو کسی درخت کے نیچے آرام کرتا اور دن بھر سفر کرتا۔ راستے میں بہت سے گاؤں پڑتے تھے، جہاں سے وہ کھانے پینے کا سامان خرید لیتا۔ ایک روز اُسے ایک آدمی مِلا جس نے کمر پر ایک کٹا ہُوا درخت لاد رکھا تھا۔ گُل محمّد حیران رہ گیا۔ اُس نے کبھی اِتنا طاقت ور آدمی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر اُس آدمی کو روکا اور حیرت سے پُوچھا ”تُم اِتنا بھاری درخت اپنی کمر پر لاد کر کِس طرح چل رہے ہو؟“

وہ آدمی ہنسنے لگا، پھر بولا ”یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو اِس سے بھی زیادہ وزن اپنی کمر پر لاد کر میلوں چل سکتا ہوں۔“

گُل محمّد اُس سے بہت مُتاثّر ہُوا۔ اُس نے کہا:

”تمھارا کیا نام ہے؟ تم کہاں رہتے ہو اور کیا کرتے ہو؟“

”میرا نام بہرام ہے اور میں یہیں قریبی گاؤں میں رہتا ہوں مزدُوری کرتا ہُوں“ اُس نے بتایا۔

”کیوں اپنی طاقت یہاں ضائع کر رہے ہو؟ چلو، میرے ساتھ شہر چلو۔ وہاں قسمت آزمائی کریں گے۔“

بہرام اُس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا۔ اب دونوں مِل کر شہر کی جانب چل دیے۔ وہ اگلے گاؤں کے نزدیک سے گُزر رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا، ایک آدمی بندُوق سے نشانہ باندھ رہا ہے۔ اُنھوں نے اُس کے نشانے پر نگاہ کی تو پریشان ہو گئے۔ دُور کھیتوں میں کچھ گھوڑے کھڑے تھے۔ وہ آدمی اُنھی کو نشانہ بنا رہا تھا۔ وہ جلدی سے بھاگے اور اُس آدمی کو پکڑ کے بولے:

”ارے بھائی! یہ کیا کر رہے ہو؟ اِن گھوڑوں کو کیوں مار رہے ہو؟“

وہ آدمی بولا ”میں گھوڑوں کو نہیں مار رہا۔ اس بھڑ کو مار رہا ہُوں جو گھوڑوں کو تنگ کر رہی ہے۔“ یہ کہ کر اُس نے فائر کر دیا۔ بہرام اور گُل محمّد نے اُس کی بات کو جھوٹ جانا۔ وہ دوڑ کر اُس کھیت میں گئے جہاں گھوڑے گھاس چر رہے تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ گھوڑوں کے پاس زمین پر ایک بھڑ مری پڑی ہے۔ وہ حیران رہ گئے۔ اُنھوں نے اُس سے پُوچھا ”بھائی، تمھارا کیا نام ہے اور تم کہاں رہتے ہو؟“

اُس آدمی نے کہا ”میرا نام بشیر ہے اور میں شکاری ہُوں۔ ساتھ کے گاؤں میں رہتا ہُوں۔“

”تو بھائی تم کیوں اپنے آپ کو اِس گاؤں میں ضائع کر رہے ہو؟ ہمارے ساتھ شہر چلو۔ وہاں قسمت آزمائی کریں گے۔“

بشیر فوراً راضی ہو گیا اور اُن کے ساتھ چل پڑا۔ وہ کچھ دُور گئے تھے کہ ایک پَون چکّی نظر آئی۔ یہ چکّی آٹا پیسنے کی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی لیکن چکّی چل رہی تھی۔ وہ تینوں بُہت حیران ہُوئے مگر قریب گئے تو دیکھا کہ ایک موٹا سا آدمی مُنھ اُوپر اُٹھائے پھُونک مار رہا ہے اور اُس کی ہوا سے چکّی چل رہی ہے۔ اُن تینوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

بہرام نے کہا ”بھائی، تم تو کمال کے آدمی ہو۔ پھُونک سے اتنی بھاری چکّی چلا رہے ہو! تمھارا نام کیا ہے؟“

وہ آدمی بولا ”میرا نام قاسم خان ہے۔ اور یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اگر میں پُوری طاقت سے پھُونک ماروں، تو سارا گاؤں اُڑ جائے۔“

گُل مُحمّد نے سوچا، اِسے بھی ساتھ لے لینا چاہیے۔ اِس طرح قاسم خان بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔ اب یہ چاروں ساتھی شہر کی طرف روانہ ہُوئے۔ تھوڑی دُور گئے ہوں گے کہ ایک لمبا سا آدمی مِلا جس کی دونوں ٹانگیں

رسّی سے بندھی ہُوئی تھیں۔ وہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ چاروں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ پھر بشیر نے آگے بڑھ کر کہا ”بھائی، تمھیں کیا مُصیبت پڑی ہے کہ ٹانگوں میں رسّی باندھ رکھی ہے؟“

وہ آدمی جس کا نام کریم تھا، بولا ”بھائی، اگر میں رسّی کھول دُوں تو ایک لمحے میں ہوا ہو جاؤں اور تم کو دکھائی بھی نہ دُوں۔ میری ٹانگیں اتنی مضبُوط اور پھُرتیلی ہیں کہ دوڑنے میں کوئی میرا مُقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”تو بھائی، پھر ہمارے ساتھ شہر چلو۔ یہاں پڑے کیا کر رہے ہو؟ وہاں ہمارے ساتھ قسمت آزمائی کرنا“ گُل مُحمّد نے کہا اور اِس طرح کریم بھی اُن کا ساتھی بن گیا۔

ابھی وہ شہر نہیں پہنچے تھے کہ اُنھیں ایک اور آدمی مِلا۔ اُس نے سَر پر ایک بڑا سا ٹوپ پہن رکھا تھا، اور اُس کا دایاں کان ٹوپ میں چھُپا ہُوا تھا۔ وہ اُس کے نزدیک سے گزرے تو بہرام نے شرارت سے اُس کا ٹوپ کھینچنا چاہا۔ اُس آدمی نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے اپنا ٹوپ پکڑ لیا۔ ”کیوں بھائی، کیا تمھارے کان میں درد ہے؟“ قاسم نے پُوچھا۔

"نہیں بھائی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں" اُس نے کہا۔

"پھر یہ ٹوپ تم کان سے کیوں نہیں ہٹاتے؟" بشیر نے پوچھا۔

"اگر یہ ٹوپ میں نے کان سے ہٹا دیا تو تم سب سردی سے جم جاؤ گے۔"

"اچھا!" گل محمد نے حیرت سے کہا "بھلا وہ کس طرح؟"

"میرے دائیں کان سے ہر وقت ٹھنڈی یخ ہوا نکلتی رہتی ہے۔ اس لیے میں کان کو ٹوپ میں چھپائے رکھتا ہوں" اُس نے بتایا۔

گل محمد بولا "تم اپنی اس خوبی سے ہزاروں روپے کما سکتے ہو۔ چلو، ہمارے ساتھ شہر چلو۔ وہاں قسمت آزمائیں گے۔" اور اس طرح یہ آدمی بھی جس کا نام غلام رسول تھا، اُن کے ساتھ چل پڑا۔

اب یہ چھ آدمی، کئی دنوں کے سفر کے بعد، ایک ایسے شہر میں پہنچے جو ایک بہت بڑے بادشاہ کا دارالسّلطنت تھا۔ یہ بادشاہ ہر سال اپنے ملک میں جشن مناتا تھا اور طرح طرح کے مقابلے کرواتا تھا۔ اُس کی بیٹی شہزادی ماہ رُخ بڑی خوب صورت اور بڑی خوبیوں والی تھی۔ وہ ہر سال مختلف مقابلوں میں حصّہ لیتی اور انعام حاصل کرتی تھی۔ اُس روز بھی شہر میں جشن منایا جا رہا تھا اور ہر جگہ یہ اعلان ہو رہا تھا کہ جو شخص دوڑ کے مقابلے میں شہزادی کو شکست دے گا، اُس کے ساتھ شہزادی کی شادی کر دی جائے گی۔ کریم یہ سن کر اچھل پڑا۔ گل محمد اور دوسرے چاروں ساتھی بھی بہت خوش ہوئے۔ اُن کے ایک ساتھی کی شادی شہزادی سے ہو جاتی تو ان سب کے وارے نیارے تھے۔ ان کا دوست ان سب کی غریبی دور کر دیتا۔ وہ فوراً محل کے دروازے پر پہنچے اور دربان سے بادشاہ کے حضور جانے کی اجازت مانگی۔ دربان نے اُنھیں بادشاہ تک پہنچا دیا۔

"ٹھیک ہے" بادشاہ نے کہا "مگر اچھی طرح سوچ لو۔ اگر تم یہ مقابلہ ہار گئے تو تمھارا سر قلم کر دیا جائے گا۔" بادشاہ کو یقین تھا کہ موت کے ڈر سے کریم بھاگ جائے گا۔ مگر وہ فوراً تیار ہو گیا۔

غرض مقابلے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ شہزادی ماہ رُخ اور کریم کے ہاتھوں میں ایک ایک برتن دے دیا گیا۔ شہر سے میلوں دُور ایک دریا بہتا تھا۔ دونوں کو دوڑ کر وہاں سے پانی بھر کر لانا تھا۔ جو پہلے واپس آ جاتا مقابلہ جیت جاتا۔ سڑک کے دونوں طرف لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ بادشاہ جھنڈی لیے کھڑا تھا۔ جُوں ہی اُس نے جھنڈی لہرائی، کریم نے اپنی ٹانگیں کھول دیں اور وہ ہوا ہو گیا۔ سب لوگ حیران رہ گئے۔ شہزادی تو انھیں بھاگتی دکھائی دے رہی تھی لیکن کریم کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ اتنا آگے نکل گیا تھا کہ شہزادی پورا دن بھی دوڑتی تو اُس تک نہ پہنچ سکتی۔

موسم بڑا اچھا تھا۔ پرندے چہچہا رہے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کریم نے سوچا، شہزادی تو ابھی بہت پیچھے ہے وہ تھوڑی دیر سستا لے۔ اُس نے ٹانگوں میں رسّی باندھی اور ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لے رہا تھا۔ شہزادی دوڑتی ہوئی اُس کے نزدیک سے گزر گئی اور دریا سے پانی بھر کے واپس بھی آ گئی، لیکن وہ سوتا ہی رہا۔

اُدھر وہ پانچوں دوست وقت گزاری کے لیے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ کریم ایک درخت کے نیچے لیٹا سو رہا ہے اور شہزادی پانی لے کر واپس آ رہی ہے۔ بشیر نے جلدی سے بندوق اُٹھائی اور کریم کے کان کے پاس فائر کر دیا۔ وہ گھبرا کے اُٹھ بیٹھا۔ جیسے ہی اُس نے شہزادی کو واپس آتے دیکھا، جلدی سے اپنی ٹانگوں کو کھولا اور ہوا ہو گیا۔ اُس نے جلدی سے دریا سے پانی لیا اور اُسی طرح ہوا کی طرح دوڑتا شہزادی کے واپس آنے سے پہلے بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مقابلہ جیت گیا تھا۔

اب تو بادشاہ بہت پریشان ہوا۔ اُسے تو کریم کے جیتنے کی بالکل اُمید نہ تھی۔ شہزادی ماہ رُخ نے بھی کریم کے ساتھ شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ خود یہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اُن چھیوں ساتھیوں کو پکڑ کر لوہے کے ایک کمرے میں بند کر دیا اور کمرے کے چاروں طرف آگ دہکا دی۔ آگ کی گرمی سے لگتا تھا کہ وہ جل بھن کر کباب بن جائیں

گے کہ اچانک غلام رسول نے اپنے ٹوپ کو دائیں کان سے ہٹا دیا۔ اب کیا تھا، ٹھنڈی یخ ہوا اُس کے کان سے نکل کر چاروں طرف پھیل گئی اور تپتا ہوا کمرا ٹھنڈا ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنے آدمیوں سے لوہے کا کمرا کھلوایا تو چھ بھنتے ہوئے آدمیوں کے بجائے چھ زندہ آدمی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ وہ حیران رہ گیا!

اب بادشاہ کو خیال آیا کہ اگر میں انھیں انعام کا لالچ دوں تو یہ لوگ میرے شہر سے چلے جائیں گے۔ اُس نے کہا "میں ایک بوری ہیرے اور جواہرات کی تمھیں اپنے خزانے سے دوں گا مگر اِس شرط پر کہ تم لوگ راتوں رات یہاں سے نکل جاؤ اور پھر کبھی اپنی شکل نہ دکھاؤ۔"

گل محمد نے سوچا کہ ہیرے جواہرات کی ایک بوری سے چھ غریب گاؤں کی غریبی بھلا کس طرح دُور ہو سکتی ہے۔ اُس نے سوچا، خوب سوچا اور پھر اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اُس نے بادشاہ سے کہا "بادشاہ سلامت، ہماری بھی ایک شرط ہے۔ بوری ہماری اپنی ہوگی۔" بادشاہ نے فوراً ہامی بھر لی۔

گل محمد نے شہر میں ایک بوریاں سینے والے سے اِتنی بڑی بوری بنوائی کہ بادشاہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس میں تو اُس کے سارے خزانے کے ہیرے جواہرات بھر جاتے۔ پھر اُس نے سوچا، اگر میں اِس بوری کو بھر بھی دوں تو یہ لوگ اُسے اُٹھا کیسے سکیں گے۔ چناں چہ اُس نے سارا خزانہ بوری میں بھر دیا۔ لیکن جب بہرام نے بوری کو اپنی پُشت پر لادا اور بڑے آرام سے چل پڑا، تو بادشاہ اور اُس کے آدمیوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بادشاہ نے اپنی فوج کو اِشارہ کیا کہ وہ اِن آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔

موٹے قاسم نے، جو اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گیا تھا، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُنی تو پلٹ کر دیکھا۔ بادشاہ کی فوج تلواریں لہراتی آ رہی تھی۔ اُس نے فوراً پھیپھڑوں میں ہوا بھری اور پوری قوت سے فوجیوں کی طرف پھونک ماری۔ فوج کے سپاہی گھوڑوں سمیت یوں ہوا میں اُڑ گئے جیسے تنکے اور خشک پتّے۔

عقل مند اور ذہین گل محمد اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاؤں واپس آیا اور سارا خزانہ اپنے ساتھیوں میں برابر برابر بانٹ دیا۔ اب اِن میں سے کسی کا گاؤں غریب نہیں رہا تھا۔ سب لوگ خوش حال ہو گئے تھے اور اُٹھتے بیٹھتے اُنھیں دُعائیں دیتے تھے۔

انصاف

مقبول انور داؤدی

خلیفہ ہارون رشید عباسی خاندان میں ایک عظیم شہنشاہ ہوا ہے۔ امین اور مامون اُس کے دو بیٹے تھے۔ ہارون رشید کا اِنتقال طُوس میں ہُوا اور وہ وہیں دفن ہُوا۔ دونوں بھائیوں میں تخت کے لیے لڑائی ہُوئی جس میں مامون کامیاب ہُوا اور اُس نے بڑے اِطمینان وسکون سے حکومت کی۔

مامون خود صاحبِ علم تھا، اِس لیے اہلِ علم کا قدردان تھا۔ اُس نے بغداد میں ایک بیتُ الحکمت قائم کیا جہاں دُوسری زبانوں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ مامون نے ہندوستان سے بھی سنسکرت کی کتابیں منگوا کر اُن کے عربی میں ترجمے کرائے۔

مامون اگرچہ ایک عظیم حکمران تھا لیکن اُس کے مزاج میں بڑا اِنکسار تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کسی کے گناہوں کو معاف کر دینے سے مجھے ایک خاص قسم کی لذت اور مسرت ملتی ہے۔ اگر لوگوں کو میری اِس خُوبی کا علم ہو جائے تو وہ میرے پاس اپنے گناہوں کے تحفے لایا کریں۔

مامون کا ایک بیٹا عباس اپنے باپ کے بالکل اُلٹ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ تمام دُنیا ہماری غُلام ہے اور ہم اُن کے آقا ہیں۔ وہ سیر و شکار کا بھی بڑا شوقین تھا۔ ایک دن وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار سے واپس آ رہا تھا۔ شام کا جھٹ پُٹا تھا۔ وہ بغداد کی بیرونی بستی کے قریب پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ ایک بہت خوب صُورت عورت کنوئیں سے پانی نکال رہی ہے۔ عباس کچھ دیر تو اُس خاتون کو ہکا بکا کھڑا تکتا رہا۔ پھر گھوڑے کو آگے بڑھایا اور پُوچھا "اے خاتون، تُو کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟"

شہزادے کی گفتگو سُن کر عورت کا چہرہ غُصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے بڑی نفرت اور حقارت سے شہزادے کی طرف دیکھا اور پانی کا گھڑا بغل میں دبا کر جلد جلد قدم اُٹھاتی اپنے گھر کو چل دی۔ شہزادہ عباس نے عورت کے اِس رویّے کو اپنی توہین خیال کیا اور فیصلہ کیا کہ اِس مغرور عورت کے ساتھ شادی کر کے اِس کے غرور کو خاک میں ملا دینا چاہیے۔ اُس نے اپنے ایک خاص خادم کو حکم دیا کہ وہ فوراً اس عورت کا حسب نسب معلوم کرے اور اُس کی طرف سے اُسے شادی کا پیغام دے۔

اگلی صُبح خادم نے حاضرِ خدمت ہو کر بتایا کہ حضُور یہ عورت خاندانِ برامکہ سے ہے اور اس کا نام مُغیرہ ہے۔ یہ ایک بیوہ عورت ہے۔ اِس کے خاوند کا نام حُسین بن مُوسیٰ تھا اور یہ دو بچّوں کی ماں بھی ہے۔ خادم نے شہزادے کو یہ بھی بتایا کہ جب اُس نے خاتُون کو حضُور کی طرف سے شادی کا پیغام دیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی اور انتہائی غُصّے سے کہا کہ ہارون ہماری جانیں لے چکا ہے اور اب مامون ہماری عزت کے درپے ہے۔ اُس نے چلّا کر کہا "جاؤ! عباس سے جا کر کہہ دو کہ اگر اُس نے اِس سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اُس کی ساری شاہ زادگی اِس جھونپڑی کی چوکھٹ پر مسل کر رکھ دی جائے گی۔"

خادِم کی یہ بات سُن کر عبّاس غصّے میں کانپنے لگا۔ اُس نے کہا "تم جاؤ۔ ہم دیکھ لیں گے برامکہ کی اِس عورت کو۔"

اگلے روز مُغیرہ صُبح کی نماز پڑھ کر فارِغ ہی ہُوئی تھی کہ ایک سپاہی شہزادے کا یہ حکم لے کر آیا کہ تمھارا یہ مکان بحقِ سرکار ضبط کر لیا گیا ہے۔ دو گھنٹے کے اندر اندر مکان خالی کر دو، ورنہ تمھارے گھر کا سامان باہر پھینک دیا جائے گا۔"

مُغیرہ سفید چادر سر پر ڈال کر اور اپنے دونوں بچّوں کو ساتھ لے کر گھر سے نکلی اور سیدھی خلیفہ مامُون رشید کے دربار میں پہنچی۔ عبّاس بھی اُس وقت مامُون کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ مُغیرہ نے کہا "امیر المومنین! ایک بیوہ اپنی عزّت کی حفاظت کے لیے اپنے مکان میں بیٹھی تھی۔ اب یہ مکان آلِ عبّاس کو مُبارک ہو۔ لیکن مامُون! کان کھول کر سُن لو۔ ایک دِن تمھیں بھی اُس شہنشاہ کے سامنے پیش ہونا ہے جس کی سلطنت کبھی فنا ہونے والی نہیں۔ وہاں میری فریاد سُنی جائے گی اور تمھیں اِس کا جواب دینا پڑے گا۔ اے خلیفہ! میں تیرے پاس ایک ظالم کی فریاد لے کر آئی ہُوں۔ اِس کا اِنصاف تُو یہاں کرے گا یا قیامت کو اِس کا حساب دے گا؟"

خلیفہ نے پُوچھا "وہ کون ظالم ہے جس نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے؟"

عورت نے چیختے ہوئے کہا "تیرا بیٹا عبّاس، جو تیرے پہلو میں بیٹھا ہے۔"

یہ سُنتے ہی مامُون کا چہرہ لال ہو گیا۔ اُس نے عبّاس کو حکم دیا کہ اُٹھو اور عورت کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور اپنی صفائی پیش کرو۔ مُغیرہ بڑی جُرأت اور دِلیری سے اپنی شکایت بیان کر رہی تھی۔ اُس کے مقابلے میں جب شہزادے سے کوئی بات پُوچھی جاتی تو اُس کی آواز لڑکھڑانے لگتی۔ نگاہیں جُھک جاتیں۔

مامُون کو یقین ہو گیا کہ عبّاس قصوروار ہے۔ اُس نے کہا "عبّاس! اِس خاتُون سے اپنی زیادتی کی معافی مانگو۔ اگر اِس نے معافی نہ دی تو تمھیں جیل جانا ہوگا۔"

عبّاس نے مُغیرہ سے بڑی لجاجت سے معافی مانگی اور مُغیرہ نے اُسے معاف کر دیا۔

خلیفہ نے مُغیرہ کو پانچ سو اشرفیاں دیں اور نہ صِرف اُس کا ضبط شُدہ مکان اُسے مِل گیا بلکہ عبّاس کے لیے جو محل بنوایا گیا تھا، وہ بھی مُغیرہ کے حوالے کر دیا گیا۔

مضبوط سہارے

انجم ناز

"ٹر ٹر رر رن" بیل تھرّا اُٹھی۔ نُعمان نے بیل سے اُنگلی ہٹالی اور گیند اُچھالنے لگا تھوڑی دیر بعد واصف نے دروازہ کھولا۔

"اِتنی دیر لگادی!" نُعمان نے واصف کی طرف دیکھا "ارے! تمھارا چہرہ کیوں اُترا ہُوا ہے؟"

"کچُھ نہیں۔"

"کچُھ تو ہے۔"

"کہا نا، کچُھ نہیں" واصف تیوری چڑھا کر بولا۔

"تمھارا مُوڈ تو زبردست خراب لگ رہا ہے۔"

"تو تمھیں کیا؟ مجُھے نہیں کھیلنا آج۔ جاؤ، یہاں سے۔"

"مجُھے کچُھ کیوں نہیں ہوگا؟ میں تمھارا دوست ہُوں۔ اگر تم نہیں کھیلنا چاہتے تو نہ سہی۔ لیکن کچُھ بتاؤ تو سہی، ہُوا کیا ہے؟"

واصف باہر نِکل آیا "آؤ گراؤنڈ میں چلیں۔" سارے راستے وہ چُپ رہے۔

"ہاں۔ اب بتاؤ" نعمان نرم نرم گھاس پر بیٹھتے ہُوئے بولا۔

"کیا بتاؤں۔ وہی انگلش کی مُصیبت۔ آج پھر ٹیسٹ ہُوا تھا۔ بیس میں سے صِرف دو نمبر آئے۔ بابا نے الگ ڈانٹا۔ ماسٹر صاحب سے ڈانٹ تو پڑنی ہی تھی۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے" نُعمان نے سر ہلایا "ویسے بھئی، انگلش کوئی اتنی مشکل تو نہیں ہے۔"

"تمھیں آتی جو ہے" واصِف جل کر بولا۔

"بھئی، میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔"

واصِف غُصّے سے گھاس توڑنے لگا "آج ماسٹر صاحب نے بہُت ڈانٹا۔ کہ رہے تھے میں اُن سے ٹیوشن پڑھوں۔"

"پھر؟"

"معلوم ہے، اُن کی فیس کتنی ہے؟ گھر کا خرچ تو پہلے ہی اِتنی مشکل سے چلتا ہے، اُوپر سے یہ ٹیوشن کا بوجھ بھی بابا کے کندھوں پر ڈال دُوں۔"

"بابا اوور ٹائم بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"ہاں۔ کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ دن کے کام سے اِتنا تھک جاتے ہیں کہ ہِلنے کی طاقت نہیں رہتی۔ اب میں بے شرم بن کر اُن سے یہ نہیں کہ سکتا کہ میری ٹیوشن فیس کے لیے اوور ٹائم بھی کریں۔ بابا کی بڑی خواہش ہے کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں۔ لیکن یہ انگلش! اِس انگلش کی وجہ سے شاید میں پاس بھی نہ ہو سکوں۔"

"واصف بھئی، اِتنا بھی کیا مایُوس ہونا" نُعمان بولا۔

"مایُوس نہ ہُوں تو اور کیا کروں؟"

نُعمان نے گھڑی پر نظر ڈالی "ارے! چار بج گئے۔ میں چلتا ہُوں۔ ٹیوشن کا وقت ہو گیا ہے۔ ماسٹر صاحب آگئے ہوں گے۔" یہ کہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

دُوسرے دِن وہ مِلے تو واصِف نے پُوچھا "نُعمان، تم ماسٹر کو کتنی فیس دیتے ہو؟"

"تین سو روپے۔"

"کتنے مضمون پڑھتے ہو؟"

"صِرف ایک — حساب۔"

"ارے! ایک مضمون کے 300 روپے!" واصف کا مُنھ کھُلا کا کھُلا رہ گیا "تمھارے ابُّو کیسے 300 روپے دیتے ہوں گے؟"

"اُسی طرح جیسے دیتے ہیں" نُعمان اِترا کر بولا۔

"نہیں۔ میرا مطلب ہے وہ کیسے تمھارا خرچ پُورا کرتے ہیں؟ سکول کی فیس، کتابیں، کپڑے، گھر کا خرچ اور پھر اُوپر سے یہ ٹیوشن کی فیس،" واصف حیرانی سے بولا۔

"میرے ابُّو دو نوکریاں کرتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ صُبح وہ دفتر جاتے ہیں اور شام کو پانچ بجے ایک اور جگہ کام

کرتے ہیں۔ رات کو دس بجے گھر آتے ہیں۔ اس طرح وہ میرا خرچ پورا کرتے ہیں" واصف نعمان کی بات سن کر خاموش ہوگیا۔

"کیا ہوا؟ چپ کیوں ہوگئے؟" نعمان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں سوچ رہا ہوں، تمھارے ابو کتنی محنت کرتے ہیں۔ وہ تو آرام بھی صحیح طور پر نہیں کرپاتے ہوں گے۔"

"ہاں، یہ تو ہے" نعمان مسکرایا۔

"لیکن نعمان۔" واصف پھر خاموش ہوگیا۔

"خاموش کیوں ہوگئے؟"

"جب تمھارے ابو تمھارا مستقبل سنوارنے کے لیے اپنا آرام ختم کرسکتے ہیں، دن رات محنت کرسکتے ہیں تو تم کیوں نہیں کرسکتے؟"

کیا مطلب؟ میں محنت نہیں کرتا؟"

"میرا مطلب ہے، اگر تم ٹیوشن پڑھنا چھوڑ دو تو کیا پھر بھی تمھارے ابو اوور ٹائم کریں گے؟"

"نہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے۔ وہ صرف میری فیس کے لیے کرتے ہیں۔"

"تو پھر تم ٹیوشن پڑھنا چھوڑ دو۔"

"ارے واہ! مجھے فیل ہونا ہے کیا؟"

"کیوں؟ فیل کیوں ہوگے؟"

"بابا جی! حساب تو میرے پلے کبھی پڑا ہی نہیں۔ یہ تو ماسٹر کے طفیل پاس ہوجاتا ہوں ورنہ حساب میں تو بالکل زیرو ہوں۔ جیسے تم انگلش میں ہو" نعمان ہنسا۔

"لیکن نعمان، جب ہمارے والدین ہمارے آرام کے لیے سوچ سکتے ہیں تو ہم ان کے آرام کے لیے کیوں نہیں سوچ سکتے؟"

"بھئی، یہ کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟" نعمان جھنجھلا کر بولا۔

"دیکھو نعمان، تم ٹیوشن پڑھنا چھوڑ دو۔"

"اچھا، اور فیل ہوجاؤں۔"

"نہیں تم فیل نہیں ہوگے۔"

"وہ کیسے؟"

"تمھاری انگلش بہت اچھی ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں۔ وہ تو ہے" نعمان سینہ پھلا کر بولا۔

"اور میرا حساب بہت اچھا ہے۔"

"ہاں۔ یہ بھی ہے" نعمان نے سر ہلایا۔

"تو کیوں نہ ہم ایک دوسرے کے ماسٹر بن جائیں؟"

"ہائیں!" نعمان نے آنکھیں گھمائیں۔

"بھئی، سیدھی سی بات ہے۔ آدھی چھٹی میں اور چھٹی کے بعد آوارہ پھرنے کی بجائے میں تمھیں حساب کرادیا کروں گا اور تم مجھے انگلش۔"

"ارے، واہ! میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔" نعمان خوشی سے بولا۔

"نہیں سوچا تو اب سوچ لو۔ اس طرح تمھارے ابو کی مشکل بھی آسان ہوجائے گی اور میری اور تمھاری بھی۔"

"منظور ہے" نعمان نے مضبوطی سے واصف کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نعمان نے ٹیوشن بند کردی اور ابو کو بھی اوور ٹائم سے منع کردیا۔ اس کے بعد دونوں کو جب بھی موقع ملتا، کتابیں لے کر بیٹھ جاتے۔ کبھی حساب کے فارمولوں پر زور آزمائی کرتے تو کبھی انگلش کے ساتھ کشتی شروع ہوجاتی۔ ہنستے ہنساتے دونوں ایک دوسرے کو پڑھاتے رہے۔ انھوں نے کھیلنا بالکل ختم نہیں کیا تھا کیوں کہ پڑھائی کے ساتھ کھیل بھی بہت ضروری ہے۔ کھیل سے جسم صحت مند رہتا ہے، اور جسم صحت مند ہو تو دماغ بھی صحت مند ہوتا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ سالانہ امتحان نزدیک آگئے۔ دونوں نے خوب محنت کی۔ انگلش کے پیپر کے دن پہلے واصف کی ٹانگیں کانپا کرتی تھیں۔ لیکن اس دفعہ اسے اپنی محنت پر یقین تھا۔ اس نے پورے اعتماد کے ساتھ پیپر حل کیا۔ پرچے کے بعد نعمان نے سارا پرچہ اس سے پوچھا۔ اسی طرح حساب کے دن نعمان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے کی بجائے اطمینان کی جھلک تھی۔

"کیسا پرچہ ہوا؟" واصف نے نعمان سے پوچھا۔

"شان دار!" نعمان کھل کر بولا۔

"کیا واقعی؟" واصف نے حیرانی سے کہا۔

"تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں۔ اور دیکھو۔ ذرا ملاؤ اپنے جوابات۔"

"ارے واہ! تم نے تو کمال کردیا!" واصف خوش ہوکر بولا۔

نتیجے کے دن نعمان کی امی بیٹے کو دعائیں دے رہی تھیں "خدا کرے تم اچھے نمبروں سے پاس ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا، امی جی۔"

"خدا کرے۔ لیکن بیٹا، تمھارے حساب سے مجھے ڈر لگتا ہے پھر تم نے ٹیوشن بھی بند کروا دی تھی۔"

"تو کیا امی، صرف ٹیوشن پڑھنے سے ہی میں پاس ہو سکتا ہوں؟ میں محنت نہیں کر سکتا؟ یہ ٹیوشن وغیرہ تو صرف عارضی سہارے ہیں۔ ان کے سہارے چلتے چلتے انسان خود چلنا بھول جاتا ہے۔ ہمیں ان عارضی اور کمزور سہاروں کی بجائے مضبوط سہارا چاہیے۔ اپنی محنت کا سہارا!"

اُسی وقت واصف اندر داخل ہُوا اور بولا "اب چلو گے بھی یا باتیں ہی کرتے رہو گے؟ رزلٹ نکلنے والا ہے۔"

"اچھا امّی، میں چلتا ہوں، خُدا حافظ!" ماں نے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور دُعائیں دیں۔

رزلٹ نکلا تو دونوں خوشی سے بغل گیر ہو گئے۔ انھیں اپنی محنت کا ثمر بہُت میٹھا ملا تھا۔ واصف بولا "نعمان، میں تمھارا کیسے شکریہ ادا کروں؟"

"خاموش! کوئی ضرورت نہیں ان تکلّفات کی۔ یہی تو دوستی کا حق ہے جو تم نے ادا کیا اور میں نے ادا کیا۔ آج ہم دونوں نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ دوست وہی ہوتا ہے جو مصیبت میں دوست کی مدد کرے۔ اب آؤ، گھر چلیں۔ گھر والوں کو بھی تو خوش خبری سُنانی ہے۔"

"اوہ! ہاں۔ مجھے خوشی میں یاد ہی نہیں رہا تھا۔"

دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، مسکراتے گھر کی طرف چل دیے۔

انار

انار مزے دار پھل ہی نہیں، ایک مُفید دوا بھی ہے۔ اس سے بہُت سی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس کا درخت دس فٹ سے پندرہ فٹ تک اُونچا، تنا پتلا اور چھال اکثر بھوری ہوتی ہے۔ پھول گہرے سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں چھلکا باہر سے سُرخ یا زرد اور اس کے اندر سُرخ یا سفید رنگ کے دانے موتیوں کی طرح گُتھے ہوئے ہوتے ہیں۔

انار میں وٹامن سی اور ڈی کے علاوہ کچھ معدنی اجزا (منرلز) بھی پائے جاتے ہیں۔ طبیب اس کے رس، چھلکوں، چھال، پتوں اور جڑ سے بہُت سی دوائیں بناتے ہیں۔ یہ پھل دل، دماغ، معدے، انتڑیوں اور مثانے کی بیماریوں سے بچاتا ہے۔ پاگل پن اور خفقان جیسی بیماریوں میں بھی اس کا استعمال بڑا فائدہ مند ہے۔ معدے کی اکثر بیماریوں مثلاً بھوک نہ لگنے، پیٹ کے کیڑوں، متلی اور بدہضمی کا بہترین علاج ہے۔

انار کا اصل وطن کون سا ہے؟ اس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہتے ہیں کہ یہ پھل عرب میں پایا جاتا تھا۔ وہیں سے اس کے پودے دُوسرے ملکوں میں پہنچے۔ اب پاکستان، بھارت، افغانستان، ایران، عرب ممالک، وسطی ایشیا اور جنوبی یورپ میں اُگایا جاتا ہے۔

یہ پھل امیروں اور غریبوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔ مُغل بادشاہوں کا تو یہ بہُت پسندیدہ پھل تھا۔ کہتے ہیں کہ مُغل بادشاہ ظہیرالدّین بابر اس کے پودے ہندوستان لایا تھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اس پھل کو بہُت پسند فرماتے تھے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ انار کے رس میں جنّت کے پانی کا قطرہ شامل ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں بھی اس پھل کا ذکر آیا ہے۔

انار چوں کہ بہُت سے ملکوں میں پایا جاتا ہے، اس لیے اس کے بہُت سے نام ہیں۔ لاطینی زبان میں اسے پونیکا گرینیٹم، انگریزی میں پومی گرینیٹ (POMEGRANATE)، سنسکرت میں دادم، بنگالی میں ڈاڈم، سندھی میں داڑھوں، کشمیری میں ڈانٹ، عربی میں رُمّان، اور اُردو، پنجابی، پشتو، فارسی اور بلوچی میں انار کہتے ہیں۔

ایل بی ڈبلیو کی پانچویں اپیل بھی منظور نہ ہوئی تو باؤلر کو تاؤ آگیا۔ وہ امپائر کی طرف پلٹا اور غصے سے بولا "جنابِ عالی، یہ تو بتائیے، آپ کی چھڑی کہاں ہے؟"

"چھڑی؟ کیسی چھڑی؟ میرے پاس کوئی چھڑی نہیں" امپائر نے حیرت سے کہا۔

"کمال ہے!" باؤلر غرّایا "میں نے آج تک کسی اندھے کو بغیر چھڑی کے نہیں دیکھا!" (محمد سلیم۔ تنگڑیال)

ایک صاحب گھبرائے ہوئے گھر واپس آئے اور بیوی سے بولے "بیگم، میں دفتر سے آ رہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا........"

اِتنے میں اُن کی ایک بچّی بول اُٹھی "امی، ثمینہ نے میری گڑیا توڑ دی۔"

بیوی نے کہا "اچھا بیٹی، ہم تمھیں دُوسری گڑیا لا دیں گے۔"

"ہاں تو بیگم، میں کہ رہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا......" شوہر نے پھر کہنا شروع کیا۔

اِتنے میں اُن کا لڑکا بول اُٹھا "امی، امی، مجھے گڈّو نے مارا......"

بیوی جھلّا کر بولی "بھئی، خُدا کے لیے چُپ ہو جاؤ۔ مجھے گدھے کی بات سُننے دو۔" (عاشی عبدالرشید۔ مقام کا نام نہیں لکھا)

ایک کنجوس آدمی سے اُس کے دوستوں نے مسجد کے لیے چندہ دینے کے لیے کہا۔ اُس نے جھٹ دس ہزار رُوپے کا چیک لکھ دیا۔ دوستوں نے اُس کی تعریف کی اور کہا "اب اِس پر دستخط بھی کر دو۔"

کنجوس بولا "معاف کیجیے۔ میں نیک کاموں میں اپنا نام ہمیشہ پوشیدہ رکھتا ہوں۔" (غلام محی الدین۔ پشاور)

باپ نے اپنے چھوٹے لڑکے سے کہا "آج شام کو ہمارے گھر ایک مہمان آئیں گے۔ اُن سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا۔"

مہمان آئے تو اُنھوں نے لڑکے سے پُوچھا "کیوں میاں، آپ کے ابّو کا نام کیا ہے؟"

لڑکا: گُلاب جامن۔

مہمان: اور امّی کا؟

لڑکا: برفی۔

مہمان: اور آپ کی باجی کا؟

لڑکا: چَم چَم۔

مہمان: اور بھئی، آپ کا نام کیا ہے؟

لڑکا: لڈّو۔

مہمان: اچھا بھئی، آپ رہتے کہاں ہیں؟

لڑکا: مٹھائی کے ڈبّے میں۔ (راس نبیل بیگ۔ راولپنڈی)

مالک (نوکر سے): یہ تم نے چائے کیسی بنائی ہے؟

نوکر: جناب، آپ نے کہا تھا کہ جب دُودھ نہ ہو تو مِلک پاؤڈر سے چائے بنا لیا کرو۔ آج مِلک پاؤڈر بھی نہیں تھا، اِس لیے میں نے ٹالکم پاؤڈر سے چائے بنا لی۔ (مدثر حبیب۔ چیچہ وطنی)

امّی: بیٹے پپّی، خود غرض مت بنو۔ اپنے چھوٹے بھائی کو بنٹے (انٹے) دے دو۔

پپّی: لیکن امّی، یہ واپس نہیں کرے گا۔

امّی: کر دے گا، بیٹے۔ دے دو۔

پپّی: کیسے کرے گا؟ دو تو یہ پہلے ہی نِگل چُکا ہے۔ (یاسر حسین۔ کراچی)

امّی: بیٹے کاشف، میں تمھیں ایک کام کے لیے بازار بھیجنا چاہتی ہوں۔

کاشف: بہت تھکا ہوا ہوں۔ نہیں جا سکتا۔

امّی: تمھیں مٹھائی کی دُکان تک جانا ہوگا۔

کاشف: (خوش ہو کر) وہ تو زیادہ دُور نہیں ہے۔

امّی: مٹھائی کی دُکان کے پاس ہی جھاڑو والا بیٹھا ہے۔ اُس سے ایک جھاڑو لے آنا۔ (سید مدثر حبیب۔ واہ کینٹ)

نئے سال کا تحفہ

رضوانہ سید علی

"آپ کو پتا ہے، کل چھٹی ہے؟"

"جی مس" سب لڑکیوں نے ایک ساتھ کہا۔

"بھلا کس سلسلے میں؟" مس نے پوچھا۔

"جی، نئے سال کی خوشی میں" لڑکیوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھئی، یہ تو آپ کو پتا ہی تھا۔ اب ذرا یہ بتائیے کہ کل آپ اپنا دن کیسے گزاریں گی؟"

سب سے پہلے سلمیٰ نے کھڑے ہو کر بتایا "مس، کل ہمارے ہاں بہت بڑی پارٹی ہو رہی ہے۔"

ہما بولی "مس، کل ہمارے بھائی جان ہمیں پک نک پہ لے جائیں گے۔"

غرض سب لڑکیوں نے اپنے اپنے پروگرام بتا دیے۔ مس خاموشی سے سنتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں "واہ بھئی! نئے سال کا استقبال تو آپ لوگ بہت جوش و خروش سے کریں گے۔ میری دعا ہے کہ یہ سال آپ کے لیے اچھا ثابت ہو۔ لیکن کل کی مصروفیات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر ذرا غور کرنا کہ آپ کا پچھلا سال کیسے گزرا۔ آپ نے کتنے اچھے کام کیے۔ کہیں آپ کی ذات سے کسی کو دکھ تو نہیں پہنچا۔ آپ کی شرارتوں سے کسی کا نقصان تو نہیں ہوا۔ اور پھر عہد کرنا کہ اگلے سال آپ زیادہ سے زیادہ اچھے کام کریں گے ٹھیک ہے؟"

"جی" سب لڑکیوں نے کہا۔

"بھئی، مجھے ایک اور بھی خیال آیا ہے۔ کیوں نہ پرسوں ہم سب اکٹھے ہو کر اپنے اُس کام کے بارے میں بتائیں جو پچھلے سال کا ہمارا سب سے اچھا کام تھا۔ جس لڑکی کا کام سب سے اچھا ہو گا، میں اسے انعام دوں گی۔"

سب لڑکیوں نے مس کی یہ تجویز پسند کی۔

آج نئے سال کا دوسرا دن تھا۔ پانچویں کلاس کی لڑکیوں کے پچھلے سال کے اچھے کام سننے کے لیے میڈم اور چند استانیاں بھی کلاس میں آگئی تھیں۔ کلاس ٹیچر ایک خوب صورت سا ڈبا بھی لے کر آئی تھیں جس میں تحفہ بند تھا۔ عذرا نے کلام پاک کی تلاوت کی۔ اِس کے بعد فاخرہ نے اپنا اچھا کام بتایا "ہمارے گھر کے سامنے ایک اندھا بابا چھابڑی لگاتا ہے۔ ایک دن میں سکول سے آ رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکا بابا سے چیز خرید کر انھیں کھوٹی اٹھنّی دے رہا ہے۔ میں نے اُس لڑکے کو بتایا کہ کسی اندھے کو ستانا بہت بری بات ہے۔ وہ لڑکا بہت شرمندہ ہوا اور معافی مانگ کر چلا گیا۔ بابا نے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں۔"

کسی معذور کی مدد کرنا اور کسی کو برے کام سے روکنا بہت اچھی بات ہے۔ فاخرہ کا یہ کام سب کو پسند آیا اور انھوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔

طلعت نے بتایا کہ اُس نے ایک دفعہ بس میں ایک بوڑھی اور بیمار عورت کو جگہ دی تھی۔ فرزانہ نے راستہ بھولی ہوئی ایک بچی کو اُس کے گھر پہنچایا تھا۔

فرح نے بتایا "میری امی کہتی ہیں کہ میں بہت شریر لڑکی ہوں لیکن میں دل کی بری نہیں۔ ایک دن میں پارک میں سیر کر رہی تھی کہ میں نے بہت سے بچوں کو ایک جگہ جمع دیکھا۔ پاس گئی تو معلوم ہوا کہ وہ کوکب کو ستا رہے ہیں۔ کوکب ہمارے گھر کے پاس رہتی ہے۔ اُس بے چاری کی نظر کم زور ہو گئی تھی اِس لیے اُسے عینک لگوانی پڑی۔ سب بچے اُسے عینکو عینکو کہہ کر چھیڑتے تھے۔ اُس دن بھی وہ اُسے چھیڑ رہے تھے اور وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑی رو رہی تھی۔ مجھے اُس پر بہت ترس آیا۔ میں نے بچوں سے کہا کہ نظر کسی کی بھی کم زور ہو سکتی ہے اور عینک کو

بڑے بڑے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ میری یہ بات سُن کر کوکب کو حوصلہ ہُوا اور بچّے شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

لڑکیاں اسی قسم کے واقعات سُناتی رہیں اور سُننے والے تالیاں بجاتے رہے۔ سب سے آخر میں افشاں اُٹھی۔ وہ بہت ذہین اور لائق لڑکی تھی۔ بولتی بہت کم تھی اور آج تو وہ اور بھی سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ اُس نے کہا:

"میں شرارتیں نہیں کرتی، نہ کسی کو ستاتی ہوں۔ لیکن میں نے پچھلے سال کوئی ایسا کام بھی نہیں کیا جسے میں سال کا سب سے اچھا کام کہہ سکوں۔ البتہ ایک چھوٹی سی بات ہے، وُہی سُناتی ہوں۔ میرے ابّو فوت ہو چکے ہیں۔ اور امّی سِلائی کڑھائی کر کے گھر کا خرچہ چلاتی ہیں۔ مگر آج کل لوگ درزیوں سے کپڑے سِلوانا پسند کرتے ہیں، اس لیے امّی کو زیادہ کام نہیں مِلتا۔

"پچھلے مہینے بھائی جان کا بی۔ اے کا داخلہ جانا تھا۔ مگر امّی کے پاس پیسے نہ تھے۔ وہ بہت پریشان تھیں۔ مجھ سے اُن کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔ میں چُپکے سے بیگم آصف کے پاس گئی۔ اُنھیں سودا سُلف منگوانے کے لیے ایک نوکر کی ضرورت تھی۔ میں نے اس شرط پر اُن کی نوکری کر لی کہ وہ دو مہینے کی تنخواہ پہلے دے دیں۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتی تھیں، اس لیے مان گئیں۔ میں نے وہ پیسے لا کر امّی کو دے دیے۔ اب مجھے بیگم آصف کا سودا لاتے ہُوئے سکول سے دیر ہو جاتی ہے اور سزا کے طور پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ کوئی کارنامہ نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے، اپنے بھائی جان کے لیے کیا ہے۔"

افشاں کی باتوں کا بچّوں کے دل پر اتنا اثر ہُوا کہ وہ تالیاں بجانا بھول گئے۔ میڈم کہنے لگیں "پیاری بچّیو، سب سے پہلے میں آپ کی ٹیچر کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اُنھوں نے آج ہمیں اتنی اچھی باتیں سُنوائیں۔ مجھے آج پتا چلا کہ بچّوں کو اچھا کام کرنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ آیندہ ہم ہر سال پُورے سکول میں یہ دن منایا کریں گے۔ یُوں سب لڑکیوں کے دل میں اچھے اچھے کام کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔ مجھے فخر ہے کہ ہمارے سکول میں افشاں جیسی باہمت لڑکیاں موجود ہیں۔ اگر میں افشاں کا کارنامہ نہ سُنتی تو اسی اُلجھن میں رہتی کہ آپ کی مِس کا لایا ہُوا تحفہ کسے دُوں۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ افشاں سے زیادہ اِس اِنعام کا اور کوئی حق دار نہیں۔ ویسے دُوسری لڑکیوں کے کام بھی قابلِ تعریف ہیں۔ میں افشاں کو اپنی طرف سے بھی ایک اِنعام دیتی ہُوں اور وہ ہے ایک سو روپیہ نقد تاکہ وہ بیگم آصف کی بقیہ رقم ادا کر دے اور سکول وقت پر آیا کرے۔" تمام لڑکیوں اور اُستانیوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔

آٹھویں کلاس کی ٹیچر نے اُٹھ کر کہا "میڈم، کیوں نہ ہم سکول میں ایک فنڈ قائم کریں، جس میں ہر مہینے سب بچّے اپنے اپنے جیب خرچ میں سے کچھ پیسے جمع کیا کریں اور اِس فنڈ سے ضرورت مند لڑکیوں کی مدد کی جائے۔"

افشاں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ اُس کی مِس نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا۔

سردی کے دِن آئے

عنایت علی خان

سردی کے دِن آئے بچّو — اوڑھ پہن کر باہر نکلو
لمبی لمبی راتیں ہوں گی — بستر ہی میں باتیں ہوں گی
بستر پر جب آئیں گی نانی — اُن سے سُننا خوب کہانی
بند کرو ٹھنڈی الماری — اب تو اُڑے گی نان نہاری
گاجر کا حلوا بھی پکے گا — کھاؤ گے تُم، طوطا بھی چکھے گا
گھر میں جو مہمان آئیں گے — وہ بھی یہ حلوا کھائیں گے
تڑکے ہی اُٹھ جایا کرنا — دُھوپ مزے سے کھایا کرنا
کیلے اور انار چلیں گے — باغوں میں امرُود لگیں گے
پہنو گے سویٹر اور موزے — کھاؤ گے پستے، چلغوزے
گاؤں میں رس کھیر پکے گی — مُونگ پھلی بھی خُوب چلے گی
چائے پینا، انڈے کھانا — یُوں سردی کا لُطف اُٹھانا
یُوں سردی کا لُطف اُٹھا کر — اپنے رب کا شُکر منانا

جس نے سردی کے دِن بھیجے
ٹھنڈے ٹھنڈے، چھوٹے چھوٹے

چیزیں کیسے حرکت کرتی ہیں

جب سکیٹر برف پر پھسلتا ہے تو برف سکیٹس کے نیچے پگھل کر پھسلواں ہو جاتی ہے، جس سے سکیٹس تیزی سے پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ جب سکیٹر آگے بڑھ جاتا ہے تو پگھلی ہوئی برف فوراً ہی پھر جم جاتی ہے۔
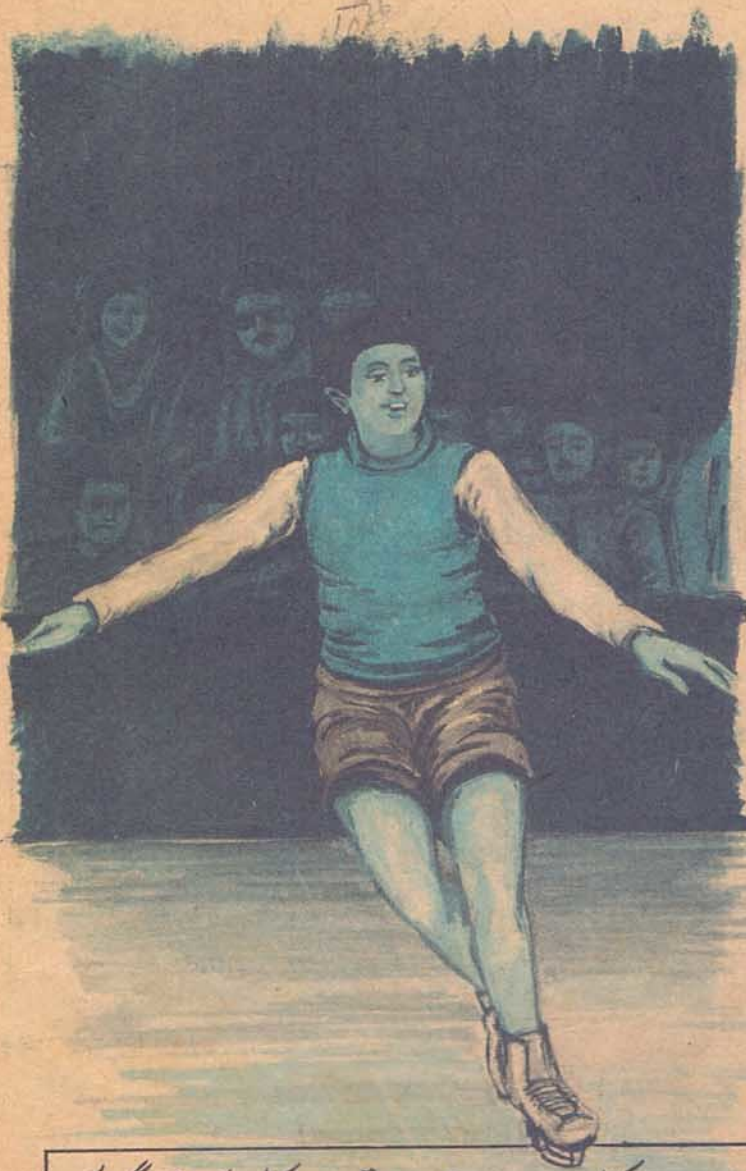
آپ کوئی پتھر ہوا میں پھینکیں تو وہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹ کر اُوپر اُڑتا چلا جائے گا۔ لیکن کسی اینٹ کو زمین پر کھسکانے کی کوشش کریں گے تو وہ اُس وقت تک آگے بڑھتی رہے گی جب تک آپ اُسے دھکا دیتے رہیں گے۔ جوں ہی ہاتھ ہٹائیں گے، وہ ٹھہر جائے گی۔ اب اِسی اینٹ یا پتھر کو پکڑ کر سر سے اُوپر اُٹھائیں اور پھر چھوڑ دیں۔ وہ آپ ہی آپ نیچے کی طرف آئے گا اور پھر زمین پر گر پڑے گا۔

چیزیں مختلف طریقوں سے حرکت کیوں کرتی ہیں؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کو حرکت میں رکھنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: دھکا اور کشش یعنی کھینچنا۔ جب آپ کوئی چیز پھینکتے ہیں تو آپ کے بازو کے پٹھے اُسے دھکا دیتے ہیں، جس سے وہ حرکت کرنے لگتی ہے۔ ٹرین کا انجن ڈبوں کو کھینچتا ہے۔ اِن دونوں صورتوں میں ایک قوّت پیدا ہوتی ہے۔ یہ قوّت یا تو دھکا ہے یا کشش۔

لیکن، یہ بات شاید آپ کو عجیب لگے کہ جب کوئی چیز ایک دفعہ حرکت میں آجاتی ہے تو پھر اُسے حرکت میں رکھنے کے لیے کسی طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی پتھر پھینکا جاتا ہے تو وہ آپ ہی آپ ہوا میں اُڑتا چلا جاتا ہے۔ دراصل پھینکنے کے عمل سے پتھر کو جو دھکا لگتا ہے، وہ اُسے حرکت کی توانائی مہیا کرتا ہے، جسے حرکی توانائی (KINETIC ENERGY) کہتے ہیں (نومبر 1988 کے تعلیم و تربیت میں اِس سلسلے کا ایک مضمون "توانائی" چھپا ہے۔ اُسے ایک بار پھر پڑھ لیجیے)۔ حرکی توانائی کی مقدار کا انحصار اِس بات پر ہے کہ پتھر کس رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ جب اِس توانائی کی مقدار کم ہو جاتی ہے تو پتھر کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور یہ اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی اور چیز پتھر سے یہ توانائی لے لیتی ہے۔ اگر ایسی چیز موجود نہ ہو تو پتھر اُسی سمت میں اُڑتا چلا جائے گا۔ لیکن آپ اُسے خواہ کتنے ہی زور سے پھینکیں، آخرکار وہ زمین پر گر جائے گا۔ کیوں کہ ہوا کی مزاحمت سے اُس کی توانائی ختم ہو جاتی ہے اور سب سے بڑی وجہ یہ کہ زمین کی کشش اُسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

اینٹ کو بھی دھکیلا جائے تو وہ حرکت کرنے لگتی ہے۔ لیکن زمین کی سطح اُس کی تمام توانائی لے لیتی ہے۔ چناں چہ جب آپ اُسے دھکا دینا بند کر دیتے ہیں تو وہ رُک جاتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ زمین

اور اینٹ دونوں کی سطحیں ناہموار ہوتی ہیں۔ اُن پر چھوٹے چھوٹے گومڑے یا اُبھار ہوتے ہیں جو ایک دُوسرے کو پکڑتے اور رگڑتے ہیں جس سے زمین کی سطح پر اینٹ کی حرکت رُک جاتی ہے۔ اِس رگڑ کو، جو ایک جسم کے دُوسرے جسم پر حرکت کرنے سے پیدا ہوتی ہے، سائنسی زبان میں مُزاحمت (FRICTION) کہتے ہیں۔

بائیسکل اور کار وغیرہ کے بریک اِسی مُزاحمت کے ذریعے کام کرتے ہیں۔ جب بائیسکل یا کار کے پہیے پر بریک دباؤ ڈالتے ہیں تو ان دونوں کی سطحیں آپس میں سختی سے مل جاتی ہیں اور پہیا رُک جاتا ہے۔ حرکی توانائی حرارت میں بدل جاتی ہے اور بریک گرم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہی مُزاحمت یا رگڑ پہیوں والی گاڑیوں کو چلاتی بھی ہے۔ جب انجن کار کے پہیوں کو گھُماتا ہے تو پہیوں کے ٹائر سڑک کی سطح کو پکڑ لیتے ہیں۔ سڑک کی سطح کی یہ مُزاحمت پہیوں کو سڑک پر پھسلنے اور رپٹنے سے روکتی ہے اور وہ گھُومتے ہوئے گاڑی کو آگے لے جاتے ہیں۔

زمین کی کشِش (GRAVITY) ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو کھینچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کوئی پتھر پھینکتے ہیں تو وہ زمین پر آ کر گرتا ہے۔ یہ زمین کی کشِش ہی ہے جو چاند کو خلا میں اِدھر اُدھر نہیں جانے دیتی۔ وہ اپنے مخصُوص مدار پر زمین کے گِرد چکّر لگاتا رہتا ہے۔ اِسی کشِش نے زمین کی فضا (ہوا) کو، جو گیسوں کا ایک غلاف ہے، تھامے رکھا ہے (صفحہ 50 پر مضمون "فضا" پڑھیے)۔ سُورج کی بھی اپنی کشِش ہے جو اُس کے نو سیاروں کو (جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے) سُورج کے چاروں طرف گھُماتی اور اُنھیں اُن کے مخصُوص مداروں سے اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتی۔ چاند زمین سے بہُت چھوٹا ہے۔ اِس لیے اُس کی کشِش زمین کی کشِش سے چھ گُنا کم ہے۔ 60 کلوگرام وزن کا ایک آدمی چاند پر جائے گا تو وہاں اُس کا وزن 10 کلوگرام ہو گا۔ (دیکھیے "چاند"، تعلیم و تربیت۔ اگست 1988)۔

گیند ٹپّا کیوں کھاتی ہے؟

ربڑ کی گیند کے اندر لاکھوں سالمے (MOLECULES) کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں، لیکن یہ ایک دُوسرے کو چھُوتے نہیں۔ ہر سالمے اور اُن کے پڑوسی سالموں کے درمیان ایک طاقت ہوتی ہے جو سپرنگ
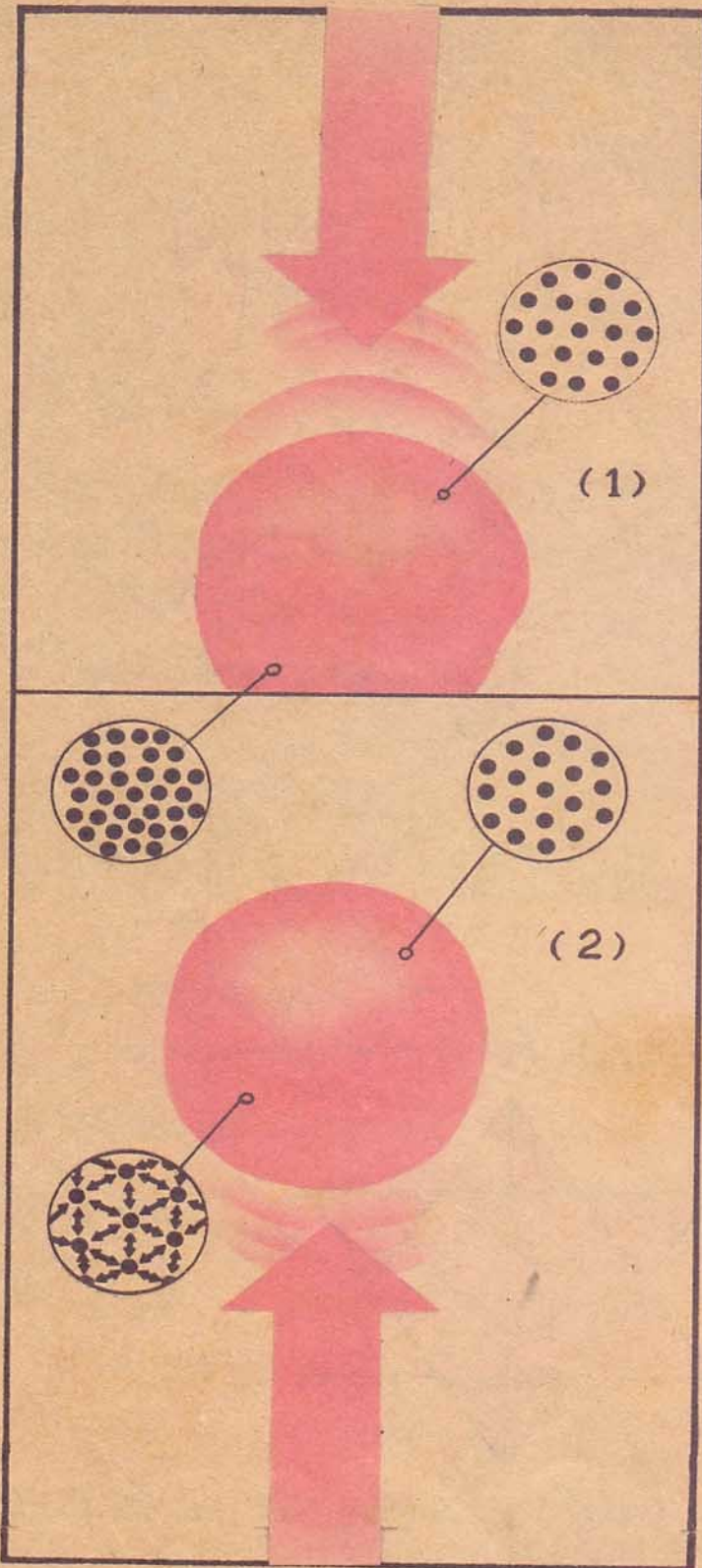
کی طرح کام کرتی ہے۔ جب گیند زمین پر گرتی ہے تو اُس کا نچلا حصّہ دبتا ہے۔ اِس دباؤ سے سالمے ایک دُوسرے سے مل جاتے ہیں۔ (شکل نمبر 1) لیکن سالموں کے درمیان جو طاقت ہوتی ہے، وہ اُنھیں دھکیل کر پھر الگ کر دیتی ہے۔ اِس دھکّے سے گیند اُچھل کر اُوپر اُٹھتی ہے، جسے ٹپّا کہتے ہیں۔ (شکل نمبر 2) (س-ل)

دِلچسپ چٹکلے

1۔ چھ گلاس قطار میں رکھیے۔ تین میں پانی ہو اور تین خالی ہوں۔

1 2 3 4 5 6

(تصویر دیکھیے)۔ اب گلاسوں کی ترتیب اس طرح بدلیے کہ پہلا گلاس بھرا ہوا ہو اور دوسرا خالی۔ تیسرا بھرا ہوا ہو اور چوتھا خالی۔ پانچواں بھرا ہوا ہو اور چھٹا خالی۔ لیکن آپ صرف ایک ہی گلاس کو چھو سکتے ہیں باقی گلاسوں کو ہاتھ لگانا منع ہے۔

2۔ ابّا جان نے رضیہ سے پوچھا "آپ کی امّی جان کہاں ہیں؟

"باورچی خانے میں نہیں ہیں" رضیہ نے جواب دیا۔

"باہر گئی ہیں" سونیا نے کہا۔

"جی ہاں۔ بازار گئی ہیں" احمد بولا

"نہیں۔ خالہ جان کے گھر گئی ہیں" دارا نے کہا۔

"نہیں۔ وہاں نہیں گئی ہیں" کاشف بولا۔

ان میں سے ایک بچّے کی بات غلط ہے، باقی بچّوں کی صحیح۔ بتائیے امّی کہاں گئی ہیں؟
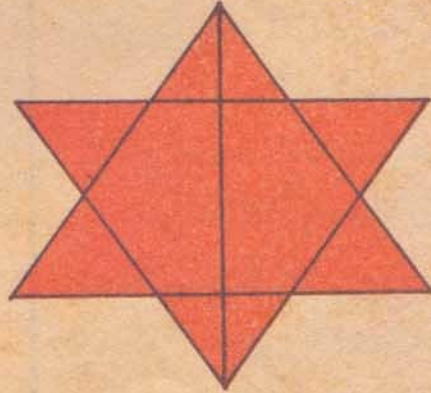
3۔ اس چھ کونوں والے ستارے میں کتنے مُثلّث (TRIANGLES) ہیں؟

4۔ جمیل کے کندھے پر آٹے کا ایک تھیلا رکھا ہے، اور شکیل کے کندھے پر اتنے ہی بڑے تین تھیلے۔ پھر بھی جمیل کا تھیلا زیادہ بھاری ہے کیوں؟

5۔ وسیم کو ماسٹر صاحب نے حساب کے 26 سوال حل کرنے کے لیے دیے تھے۔ اُس کے ابّا جان نے کہا "ہر صحیح جواب پر میں تمھیں 8 روپے دوں گا، اور ہر غلط جواب پر تم مجھے 5 روپے دو گے۔ بولو، منظور ہے؟"

وسیم نے کہا "منظور ہے۔"

دوسرے دن ماسٹر صاحب نے وسیم کا ہوم ورک چیک کیا تو نہ تو ابّا جان کو کچھ دینا پڑا اور نہ وسیم کو۔ دونوں کی رقم برابر تھی۔ بتائیے، وسیم کے کتنے جواب صحیح تھے؟

6۔ ایک ہی سائز کے چار لمبوترے کارڈ لیجیے۔ انھیں اس تصویر کے مطابق رکھیے۔ اب ایک کارڈ کی جگہ اس طرح تبدیل کیجیے کہ مُربّع بن جائے۔
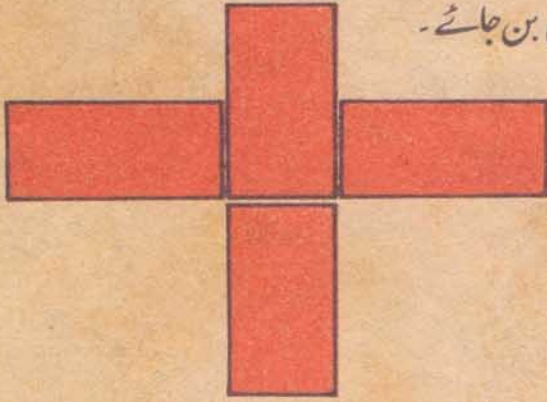
7۔ دس روپے کا نیا نوٹ میز پر رکھیے۔ اُس کے بیچوں بیچ چوڑے مُنھ کی بوتل کھڑی کیجیے۔ بوتل کا مُنھ نیچے اور پیندا اُوپر ہو۔ اب نوٹ

کو بوتل کے نیچے سے اس طرح نکالیے کہ نہ تو بوتل کو ہاتھ لگے اور نہ وہ گرے۔

8۔ کسی دوست سے کہیے کہ وہ کاغذ پر اپنا ٹیلی فون نمبر لکھے (آپ نہ دیکھیں) اب اُسے 2 سے ضرب دے۔ پھر اُس میں 5 جمع کرکے 50 سے ضرب دے۔ اس کے بعد اس میں اپنی عمر جمع کرے۔ پھر اس ٹوٹل میں 365 جمع کردے۔ اب اس میں سے 615 منفی کردے (گھٹا دے)۔

دائیں طرف کے دو ہندسے اُس کی عمر بتائیں گے اور باقی ہندسے اس کا ٹیلی فون نمبر۔ آپ کا دوست حیران رہ جائے گا۔

(جوابات صفحہ 30 پر دیکھیے)

خونی چیتا

مقبول جہانگیر

بُوڑھے شکاری کی ڈائری دل چسپ واقعات سے بھری پڑی تھی۔ اس مرتبہ ہم اس ڈائری میں سے ایک آدم خور چیتے کا واقعہ آپ کو سناتے ہیں جو ہندوستان کی ایک پہاڑی نینی تال کے گھنے جنگل میں پیش آیا تھا۔

18 ستمبر 1930 :

مجھے اس ہیبت ناک جنگل میں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے۔ یہ جنگل نینی تال سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہے اور اس سے ذرا آگے نیپال کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ جس روز میں یہاں پہنچا، اسی روز آدم خور چیتے نے ایک بارہ سالہ لڑکے کو پھاڑ کھایا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ چیتا آٹھ فٹ لمبا ہے اور اس کی زرد کھال پر سیاہ دھبے ہیں۔

اس چیتے کے آدم خور بننے کا قصہ بھی بڑا عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن یہ شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ اس نے ایک درخت کے پاس ایک سیہی دیکھی۔ سیہی چوہے کی شکل کا ایک جانور ہوتا ہے اور اس کے جسم پر لمبے لمبے کانٹے ہوتے ہیں۔ یہ کانٹے کسی کے چبھ جائیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ چیتا بہت بھوکا تھا۔ وہ سیہی پر جھپٹ پڑا۔ سیہی نے خطرہ دیکھ کر کانٹے کھڑے کر لیے۔ چیتے نے پنجہ مارا تو سیہی کے کانٹے اس کے پنجے میں گھس گئے اور وہ چیختا چلاتا بھاگ کھڑا ہوا۔

ایک روز یہ چیتا ایک درخت کے نیچے لیٹا اپنا زخمی پنجہ چاٹ رہا تھا کہ ایک آدمی درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخیں اور سوکھے پتے جمع کرنے وہاں آیا۔ اس نے چیتے کو نہیں دیکھا، لیکن چیتے نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے جی میں خدا جانے کیا آئی کہ وہ غرا کر اس آدمی پر جھپٹا اور آن کی آن میں اس کے پرخچے اڑا دیے۔ اس کا یہ پہلا انسانی شکار تھا۔ لیکن اس نے اس کے گوشت کو سونگھا تک نہیں اور لاش کو وہیں چھوڑ کر جنگل میں غائب ہو گیا۔

پنجے میں تکلیف کی وجہ سے چیتے کے لیے پیٹ بھرنا دشوار ہو گیا تھا اور وہ اکثر بھوکا رہنے لگا تھا۔ ایک روز وہ جھاڑی میں لیٹا ہوا تھا کہ ایک اور بدنصیب آدمی لکڑیاں اکٹھی کرنے کے لیے وہاں آ نکلا۔ ابھی اس نے دو چار لکڑیاں ہی چنی تھیں کہ چیتا غضب ناک ہو کر اچھلا اور اس کی گردن منھ میں دبا کر اسے نیچے گرا لیا۔ گاڑھے خون کی دھار اس کی گردن سے نکل کر چیتے کے منھ میں گئی تو اسے بڑا مزہ آیا۔ بھوکا تو تھا ہی، چند ہی لمحوں میں اسے چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ اس نے انسان تو پہلے بھی دیکھے تھے، لیکن یہ آج معلوم ہوا کہ انسان کا گوشت نہ صرف لذیذ ہوتا ہے بلکہ اسے آسانی سے شکار بھی کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے دن اس خونی چیتے نے تیسرے آدمی کی جان لی۔ جنگل میں دو لکڑ ہارے لکڑیاں کاٹ رہے تھے کہ چیتا ادھر آ نکلا۔ اس نے ایک لکڑ ہارے پر جست لگائی اور اسے گھسیٹتا ہوا جھاڑی میں لے گیا۔ دوسرا لکڑ ہارا چیختا چلاتا بستی میں آیا اور لوگوں کو یہ واقعہ سنایا۔ اب تو ارد گرد کے

سارے علاقے میں دہشت پھیل گئی۔ لوگ شام ہی سے گھروں کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہتے اور اکا دُکا آدمی جنگل میں جانے کی جرأت نہ کرتا۔

اس جنگل کے کنارے ایک ڈاک بنگلا تھا جہاں سرکاری افسر اور سیاح اکثر ٹھہرتے تھے۔ ڈاک بنگلے کے منیجر کو پتا چلا کہ میں ایک تجربہ کار اور نامی گرامی شکاری ہوں تو اُس نے مجھے بُلایا اور اُس خونی چیتے کو ہلاک کرنے کی درخواست کی۔ اُس نے مجھے آس پاس کے علاقے کا ایک نقشہ دیا اور زبانی بھی تمام حالات بتائے۔

صبح سُورج نکلنے سے پہلے ہی میں اُٹھا اور رائفل لے کر ڈاک بنگلے سے چل پڑا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ ضروری سامان لے کر میرے پیچھے پیچھے آئیں۔ میں دیکھتا بھالتا اور نہایت ہوشیاری سے قدم رکھتا اُس آبادی تک پہنچ گیا جو ڈاک بنگلے سے دُور جنگل کے سرے پر آباد تھی۔ وہاں بہت سے لوگ مجھ سے ملنے آئے اور آدم خور چیتے کی داستانیں سُنائیں۔ یہاں سے دو تین میل کے فاصلے پر ایک بہت بڑا باغ تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ باغ ایک رئیس آدمی کا ہے اور اُس کا نام رامی ہے۔ آدم خور چیتا، دو چار روز سے اِس علاقے میں گھومتا دیکھا گیا ہے۔ یہ سُن کر میں رامی سے ملنے کے لیے باغ کی طرف چل پڑا۔

اُس رات چاند پچھلے پہر نکلنے والا تھا۔ میں نے سوچا، رات کے اندھیرے میں اِس چیتے کو شکار کرنا مُناسب رہے گا۔ اُس وقت دن کے دو بجے تھے اور شام ہونے میں کافی وقت تھا۔ جب میں رامی کے باغ میں پہنچا تو اُس نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا اور خوب خاطر تواضع کی۔ اُس نے بتایا کہ اِس چیتے کو مارنے کے لیے کئی شکاری آئے تھے، لیکن وہ سب ناکام رہے۔ اُن کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ شور و غُل بہت کرتے تھے، جس سے چیتا چوکنا ہو جاتا اور وہاں سے بھاگ نکلتا۔

دن کا باقی وقت میں نے بڑی بے چینی سے گزارا، اور جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو رائفل سنبھالی اور جنگل میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میرے ہمراہ رامی اور اُس کے دو ملازم بھی تھے۔ رامی اس جنگل کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ جب میں نے اُسے وہ درخت دکھایا جس پر چڑھ کر میں چیتے کو شکار کرنا چاہتا تھا تو اُس نے مجھے اُس پر چڑھنے سے منع کیا۔ لیکن میں نے اُس کی نصیحت نہ مانی اور درخت پر چڑھ کر اپنے آپ کو پتوں میں چھپا لیا۔ رامی اور اُس کے ساتھی چلے گئے۔

اب میں اِس سُنسان جنگل میں بالکل اکیلا تھا!

سُورج غروب ہو گیا اور رات کا اندھیرا ہر طرف چھا گیا۔ میں چُپ چاپ درخت پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک بارہ سنگا بھاگتا ہوا آیا۔ اُس کے پیچھے آدم خور چیتا تھا۔ بارہ سنگا درخت کے قریب پہنچا تو چیتے نے اُسے آلیا اور ایک ہی وار میں گرا لیا۔ اُسی وقت آسمان کالے کالے بادلوں سے ڈھک گیا اور رہی سہی روشنی بھی جنگل سے غائب ہو گئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، لیکن نہ تو چیتا دِکھائی دیا اور نہ بارہ سنگا۔

تھوڑی دیر بعد چڑ چڑ کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ چیتا بارہ سنگے کا گوشت چبا رہا ہے۔ جیب ٹٹولی تو ٹارچ غائب تھی۔ یاد آیا کہ اُسے تو میں رامی کے گھر ہی بھول آیا ہوں۔ اب یہی طریقہ تھا کہ چیتے کی آواز پر گولی چلا دوں۔ ذہن میں چیتے کی جگہ کا نقشہ اچھی طرح جمانے کے بعد میں نے رائفل سیدھی کی اور خُوب غور کرکے اُس کا گھوڑا دبا دیا۔ دھائیں! سارا جنگل رائفل کی آواز سے گُونج اُٹھا۔ چیتے کے حلق سے غُرّاہٹ کی آواز نکلی اور وہ ایک دم وہاں سے بھاگا۔ خُشک پتّوں پر اُس کے دوڑنے کی آواز صاف سُنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

آدھ گھنٹے تک میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس عرصے میں کوئی آواز نہ آئی۔ فائر کرنے کے دو ہی نتیجے ہو سکتے تھے۔ یا تو چیتے کے گولی نہیں لگی اور وہ کہیں چھپ گیا، یا گولی لگ گئی اور وہ مر گیا۔ اچانک، کچھ فاصلے پر، دو چمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں جو مجھے گھور رہی تھیں۔ اور پھر چیتے کی غراہٹ سُنائی دی۔ اُس نے مجھے درخت پر بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ میں زمین سے کوئی بارہ فٹ کی بلندی پر تھا۔ وہ اندھیرے میں مجھ پر حملہ کرتا تو میں اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور رائفل تانے چوکس بیٹھا رہا۔

اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ سورج نکلنے سے کچھ دیر پہلے رامی اپنے ملازموں کے ساتھ، وہاں آ گیا۔ تمام رات درخت پر بیٹھے بیٹھے میرے ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے تھے۔ نیچے اُتر کر میں نے زمین پر چیتے کے قدموں کے نشان دیکھے تو رامی نے کہا کہ وہ جنگل میں چلا گیا ہے اور دن بھر وہیں رہے گا۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد بستی کے پندرہ بیس آدمیوں کو ساتھ لے کر ہم چیتے کی تلاش میں نکلے۔ کچھ دُور چل کر گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم مشکل سے دو فرلانگ چلے ہوں گے کہ میں ایک جگہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر آدم خور چیتا کھڑا غضب ناک نگاہوں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑا اور خود جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا چیتے کے قریب پہنچ گیا۔

یہ وقت بڑا نازک تھا۔ اگر چیتا مجھے دیکھ لیتا تو پھر میری خیر نہ تھی۔ نزدیک پہنچ کر میں نے رائفل کندھے سے لگائی اور فائر کر دیا۔ گولی اُس کے کندھے پر لگی۔ اُس نے غصّے میں آ کر زبردست چھلانگ لگائی اور فضا میں اُچھلتا ہوا مجھ سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر آ گرا۔ میں نے اُس کے سر کا نشانہ لے کر دُوسرا فائر کیا اور اُس کے دماغ کے پرخچے اُڑ گئے۔

لوگوں نے مجھے کندھوں پر اُٹھا لیا اور دیوانوں کی طرح ناچنے لگے۔ پھر چیتے کی لاش ڈاک بنگلے میں لائی گئی اور جب میں نے اُس کی کھال اُتاری تو پتا چلا کہ اُس کے اگلے پنجے میں سیہی کے ٹوٹے ہوئے کانٹے چُبھے ہوئے ہیں۔

قومی جھنڈا

قومی جھنڈے کا رواج بہت پُرانا ہے کہتے ہیں آج سے پانچ ہزار سال پہلے ایران اور اسیریا کے بادشاہوں نے قومی جھنڈے بنوائے تھے۔ (اسیریا کی سلطنت اُس مقام پر تھی جہاں اب ملک عراق ہے)

پُرانے زمانے میں، جنگ کے وقت، جھنڈا بہت بہادر اور طاقت ور سپاہی کو دیا جاتا تھا۔ اُس کے ساتھ کئی اور بہادر بھی ہوتے تھے۔ پہلا شخص مر جاتا تو دُوسرا اُس کی جگہ لے لیتا۔ وہ مارا جاتا تو تیسرا جھنڈے کو تھام لیتا۔

ہر جرنیل یا بادشاہ یہ کوشش کرتا کہ اُس کا جھنڈا گرنے نہ پائے۔ اُدھر دشمن کی یہ کوشش ہوتی کہ کسی طرح اپنے مخالف کا جھنڈا گرا دے۔ جھنڈا گرنے سے سپاہیوں کا حوصلہ ٹوٹ جاتا اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔

دُنیا کا سب سے پُرانا جھنڈا ڈنمارک کا ہے۔ یہ 1218 میں بنایا گیا تھا۔

ہر مُلک کے جھنڈے کی وضع قطع اور رنگ رُوپ الگ الگ ہے۔ ہمارے جھنڈے میں دو رنگ ہیں، ہرا اور سفید۔ ہرا رنگ مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے اور سفید رنگ غیر مسلموں کی۔

اپنے قومی جھنڈے کی عزت کرنا ہر شخص کا فرض ہے۔ کسی جگہ جھنڈا لہرایا جائے تو ادب سے کھڑے ہو جانا چاہیے۔ سینما ہال میں فلم ختم ہونے پر قومی ترانے کے ساتھ جھنڈا بھی دکھایا جاتا ہے۔ جھنڈا دیکھتے ہی فوراً کھڑے ہو جائیے اور اُس وقت تک باہر نہ نکلیے جب تک پردے پر جھنڈا نظر آتا رہے۔

س: دُنیا میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟ (سید ظفر علی۔ صدر بازار راولپنڈی)

ج: "زبان" اُسے کہتے ہیں جو بولنے کے علاوہ لکھی اور پڑھی بھی جاتی ہو۔ اور اُس میں اخبار، رسالے اور کتابیں چھپتی ہوں۔ جو صرف بولی جاتی ہے اور لکھنے پڑھنے کے کام نہیں آتی، اُسے "بولی" کہتے ہیں۔ زبانیں تقریباً تین ہزار ہیں۔ بولیاں بے شمار ہیں۔

س: آپ نے دسمبر کے تعلیم و تربیت میں بتایا تھا کہ عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سُولی دی گئی تھی۔ سُولی کسے کہتے ہیں؟ (نور احمد بھیلیلی حیدر آباد)

ج: پُرانے زمانے میں موت کی سزا پانے والے مجرموں کو لکڑی کے ایک ستون پر لٹکا کر اُن کے ہاتھ پیروں میں میخیں ٹھونک دی جاتی تھیں اور وہ اِسی حالت میں مر جاتے تھے۔ اِس ستون یا بلی کو اُردو میں سُولی، فارسی میں چلیپا، عربی میں صلیب اور انگریزی میں کراس (CROSS) کہتے ہیں۔ اِس کی شکل ایسی ہوتی تھی ✝

سُولی یا صلیب عیسائیوں کا مذہبی نشان ہے۔ وہ اپنے گرجا گھروں اور ہسپتالوں وغیرہ پر، برکت کے لیے، صلیب کی علامت لگاتے ہیں بعض عیسائی چھوٹی چھوٹی صلیبیں گلے میں پہنے رکھتے ہیں تاکہ اُن کے دل میں حضرت عیسیٰ کی یاد تازہ رہے۔ مذہبی عیسائی جب کوئی بُری خبر سُنتے ہیں تو ہاتھ سے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہیں۔ (پہلے سر سے سینے تک اور پھر بائیں کندھے سے دائیں کندھے تک)۔ اِس کا مطلب ہوتا ہے کہ خدا اُنھیں اِس آفت سے محفوظ رکھے۔

س: ہماری امی کہتی ہیں کہ سُرمہ آنکھوں کے لیے بہت مفید ہے۔ لیکن ہمارے بڑے بھائی جان کہتے ہیں کہ سُرمہ صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ (شائستہ حمید۔ ملتان)

ج: وُہی جو آپ کے بھائی جان کا خیال ہے۔ سُرمے میں سیسہ ہوتا ہے جو انسانی صحت کے لیے سخت مُضر ہے۔ بچے سُرمہ لگی آنکھوں کو ہاتھوں سے ملتے ہیں اور پھر یہی ہاتھ منھ میں ڈال لیتے ہیں، جس سے سیسہ اُن کے پیٹ میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ جن بچوں کی آنکھوں میں کثرت سے سُرمہ لگایا جاتا ہے وہ پیٹ کی بیماریوں میں مُبتلا رہتے ہیں، اُن کی جسمانی نشو و نما رُک جاتی ہے اور دماغ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ باتیں اپنی امی کو بتائیں اور کبھی بھول کر بھی سُرمہ نہ لگائیں۔ البتہ کاجل استعمال کر سکتی ہیں۔ یہ نقصان دِہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اِس میں سُرمہ نہیں ہوتا۔

س: دُنیا میں اسلامی مُلک کتنے ہیں؟ (فاروق رانا۔ شاہدرہ لاہور)

ج: جو مُلک اپنے آپ کو اسلامی مُلک کہتے ہیں اور اسلامی مُلکوں کی تنظیم (جماعت) "اسلامک کانفرنس" کے ممبر ہیں، اُن کی تعداد 46 ہے۔ اِن میں ہمارا پاکستان بھی شامل ہے۔ اِن کے علاوہ سات مُلک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تو ہے لیکن وہ اسلامی مُلک نہیں کہلاتے، اور اسلامک کانفرنس کے ممبر بھی نہیں ہیں۔ اِن مُلکوں کے نام ہیں: البانیہ، اِتھیوپیا، آئیوری کوسٹ، ملاوی، موزمبیق، تنزانیہ اور ٹوگو۔ البانیہ برِاعظم یورپ میں ہے اور باقی چھ مُلک افریقہ میں۔ اِن سب (53) مُلکوں کی مجموعی آبادی 954 ملین (954,000,000) ہے۔

س: 13 کا ہندسہ منحوس کیوں سمجھا جاتا ہے؟ (تجمل حسین زیدی۔ گجرات)

ج: یہ صرف لوگوں کا وہم ہے اور اِس وہم میں پڑھے لکھے لوگ بھی مُبتلا ہیں۔ اکثر ہوٹلوں میں تیرہ نمبر کا کمرا نہیں ہوتا۔ کئی منزلہ عمارتوں میں تیرھویں منزل نہیں ہوتی۔ بارھویں کے بعد چودھویں منزل ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکا میں تیرہ آدمی اکٹھے کھانا نہیں کھاتے۔ بہت سے لوگ تیرہ تاریخ کو کوئی اہم کام نہیں کرتے۔ عالموں نے لوگوں کے اِس وہم کی وجہ دریافت کی تو پتا چلا کہ یہ وہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت سے لوگوں کے دِلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس دِن (عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق) حضرت عیسیٰؑ کو سُولی دی گئی، اُس سے ایک دِن پہلے رات کو، آپ نے اپنے بارہ حواریوں (مُریدوں) کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ اِسے آخری عشائیہ (LAST SUPPER) کہتے ہیں۔ اُس دِن سے تیرہ کا ہندسہ منحوس سمجھا جانے لگا۔ لیکن پُرانے وقتوں کے مصری اور چینی تیرہ کا ہندسہ مُبارک سمجھتے تھے۔

س: پانی سے آگ کیسے بجھ جاتی ہے؟ (سعدیہ نکہت۔ لاہور)

ج: پہلے یہ سمجھیے کہ آگ جلتی کیسے ہے۔ آگ جلنے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں:

1۔ ایندھن (لکڑی یا کاغذ وغیرہ) گیس (2) آکسیجن (3) حرارت۔

جلتی ہوئی آگ کو تین طریقوں سے بُجھایا جا سکتا ہے (1) ایندھن کے جس حصے نے ابھی آگ نہیں پکڑی ہے اُسے وہاں سے ہٹا لیں (2) آگ کو کسی چیز سے ڈھانپ دیں۔ اُسے آکسیجن نہیں ملے گی تو وہ بجھ جائے گی (3) آگ سے اُس کی حرارت چھین لیں۔ اور یہ کام پانی سے کیا جاتا ہے۔ پانی جلتی ہوئی چیزوں کی حرارت اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، جس سے آگ بُجھ جاتی ہے۔ (س۔ل)

ہابیل قابیل

ڈاکٹر عبدالرؤف

ہماری یہ دُنیا جسے زمین کہتے ہیں، ہزار ہا سال ہُوئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی تھی۔ انسانی زندگی کی ابتدا دو نیک شخصیتوں سے ہُوئی یعنی حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی حضرت حوّاؑ۔ انسانوں کے اِس پہلے جوڑے کے ہاں بہت اولاد ہُوئی۔ ان میں دو بیٹے ہابیل اور قابیل بھی شامل تھے۔ ہابیل عُمر میں چھوٹا مگر بے حد شریف اور ملنسار تھا۔ قابیل خود غرض اور تلخ مزاج نوجوان تھا۔ ہابیل چرواہا بن گیا اور قابیل نے کھیتی باڑی اختیار کر لی۔

دونوں بیٹے جوان ہُوئے تو والدین نے ان کے لیے رشتے طے کر لیے۔ ہابیل کی ہونے والی بیوی بے حد حسین تھی مگر قابیل کے لیے مُنتخب ہونے والی لڑکی خوب صُورت نہ تھی۔ قابیل کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور وہ اپنے بھائی سے حسد کرنے لگا۔ جُوں جُوں دِن گزرتے گئے اُس کے غم و غصّہ کی آگ تیز تر ہوتی چلی گئی۔

حضرت آدمؑ بیٹوں میں ناچاقی اور تصادم ختم کرنا چاہتے تھے چُناں چہ اُنھوں نے تجویز پیش کی کہ دونوں بھائی اللہ کے حضور قربانی پیش کریں۔ اور پھر جس کی قربانی قبُول ہو جائے اُسے حسین دوشیزہ سے بیاہ دیا جائے۔ اتّفاق سے ہابیل کی قربانی قبُول ہُوئی اور قابیل کی مُسترد۔ اس سے قابیل اور خار کھا گیا اور طیش میں آکر چھوٹے بھائی کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔

بالآخر اُس نے ایک رات بے چارے ہابیل کو پتھر مار کر سوتے میں قتل کر ڈالا۔ مگر قتل کے فوراً بعد اُسے اپنے کیے پر سخت ندامت محسُوس ہونے لگی۔ اُس کا ذہنی توازُن درہم برہم ہو گیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے مقتُول بھائی کی خُون آلود لاش کو دفن کیا اور پھر دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ ایک دِن کسی نے اُس کے سر پر پتھر دے مارا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اِس دردناک سانحے سے حضرت آدمؑ اور حضرت حوّاؑ بہت پریشان ہُوئے۔ اِس کے بعد کسی نے اُنھیں کبھی مُسکراتے نہ دیکھا۔

اس کارٹون کا عنوان لکھیے اور 1000 روپے کے انعامات حاصل کیجیے۔ تین بہترین عنوانات پر 100 روپے، 75 روپے اور 50 روپے کی کتابیں دی جائیں گی۔ 31 خصوصی انعامات 25، 25 روپے کی کتابوں کے دیے جائیں گے۔ آخری تاریخ 10 جنوری ہے۔

نتیجہ بلاعنوان دسمبر 1988 ۔ تقریباً 25 ہزار بچوں نے تقریباً 500 عنوان تجویز کیے، جن میں سے صرف 8 عنوان ججوں کو پسند آئے۔

(1) "باکمال فیلڈر، بے مثال بوچھاڑ"۔ زینب بھٹی باغ بان پورہ لاہور۔ (2) "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں"۔ یوسف اقبال ماڈل ٹاؤن لاہور۔ رابعہ امجد، نیو کیمپس لاہور۔ (3) "جوابی کارروائی"۔ مسرت پروین لالہ رُخ واہ کینٹ۔ (4) "پوز اچھا ہے۔ اینگل درست کیجیے"۔ ثناء اللہ عبداللہ حیدر علی روڈ کراچی۔ (5) "میرا نشانہ، دیکھے زمانہ"۔ محمد ادریس قریشی منڈی بہاءالدین۔ مرزا فضل حق ڈیرہ غازی خان۔ توصیف اسلم خان نیازی شادمان لاہور۔ (6) "آپ فلیش ماریں میں پریشر مارتا ہوں"۔ محمد شاہد فیروز گوجرانوالہ۔ شازیہ حلیم ٹیکسلا۔ (7) "آپ کے فلیش سے میری دھار زیادہ زور دار ہے"۔ محمد امجد موضع بڈھ پیر ضلع پشاور۔ (8) "ٹھہریے! مجھے کپڑے تو پہنا دیجیے"۔ شاہینہ ایس او ایس چلڈرنز ویلیج آف پاکستان لاہور۔ جاوید احمد لیاقت آباد کراچی۔ محمد مظہر ہاشمی لاہور۔ افتخار بھٹی صدر بازار لاہور۔ عمران الٰہی ماڈل ٹاؤن لاہور۔ عامر بن یعقوب گلشنِ اقبال کراچی۔ راشد بن یعقوب گلشنِ اقبال کراچی۔ عابد بن یعقوب گلشنِ اقبال کراچی۔ روبینہ شاہین شاہ فیصل کالونی کراچی۔ سید علی الاحسن کھاریاں کینٹ۔ عاطف حلیم قریشی ٹیکسلا۔ اعجاز احمد ایس او ایس چلڈرنز ویلیج لاہور۔ آصف رضا ایس او ایس چلڈرنز ویلیج لاہور۔ زینب اجمل ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ان بچوں کو 30، 30 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔
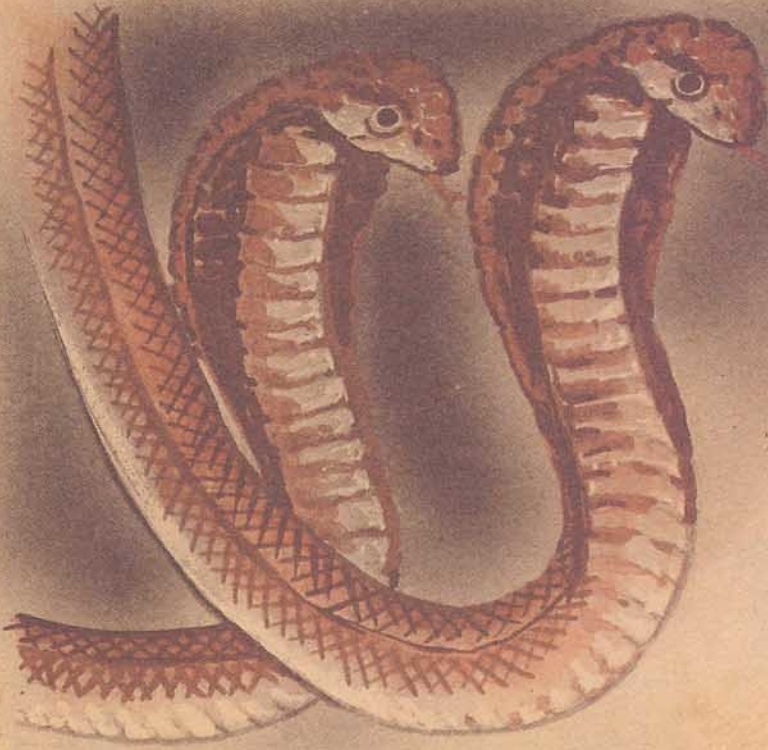
خُفیہ پھُنکار کا سِگنل

اے حمید

کامران صوفے پر بے ہوش پڑا تھا۔

کالی دیواروں والے اِس آسیبی قلعے کی کھڑکی میں سلاخوں کے پیچھے وہی زرد ڈراؤنا چہرہ ایک بار پھر نمودار ہُوا اور پیچھے ہٹ گیا۔ شکاری نے جھک کر کامران کو دیکھا اور پھر قالین پر گری ہُوئی چائے کی پیالی اُٹھا کر میز پر رکھ دی۔ اِسی پیالی کی چائے پی کر کامران بے ہوش ہُوا تھا۔ سیاہ دیواروں، سیاہ صوفوں اور پُرانی چھت والے اِس وحشت ناک کمرے میں لالٹین کی روشنی جیسے دم توڑ رہی تھی۔ شکاری نے اپنی جیکٹ میں سے نائیلون کی باریک رسّی نکال کر بے ہوش کامران کو ایک نشست والے صوفے پر اِس طرح سے باندھ دیا کہ وہ ہوش آنے پر بھی اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر شکاری تیز تیز قدم اُٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آتے ہی اُس نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اب وہ نیم روشن راہ داری میں سے گزرتا ہُوا ایک دُوسرے کمرے کا تالا کھول کر اندر چلا گیا۔ اِس کمرے کی دیواریں بھی کالی تھیں۔ صوفوں پر کالا کپڑا چڑھا ہُوا تھا۔ دیوار کے ساتھ لالٹین جل رہی تھی مگر دیواریں کالی ہونے کی وجہ سے اِس کی روشنی بہت مدّھم تھی۔ اِس پُراسرار کمرے میں بھی صوفے پر ایک خوب صُورت مغموم چہرے والی لڑکی نائیلون کی رسّی سے بندھی پڑی تھی۔ وہ بھی کامران کی طرح بے ہوش تھی۔ شکاری نے اُسے بھی جھک کر دیکھا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ لڑکی بے ہوش ہے تو وہ کمرے سے نکل گیا اور دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا۔

اندھیری رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اِس پُرانے خستہ حال قلعے کے باہر آسمان پر بادل چھائے ہُوئے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ اب بارش مُوسلا دھار شرُوع ہو گئی تھی۔ قلعے کی طرف آنے والا کچّا راستہ رات کے اندھیرے اور بارش میں سُنسان پڑا تھا۔ اتنے میں دُور سے ایک گھڑ سوار نمودار ہُوا۔ اُس نے اپنا چہرہ کالے نقاب میں چُھپا رکھا تھا۔ اُس کا لباس بارش میں بھیگ رہا تھا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا آیا، گھوڑے کو قلعے کے پُرانے دروازے کے باہر باندھا اور قلعے میں داخل ہو گیا۔ اِس کے جانے کے بعد ایک دُوسرا آدمی گھوڑے پر سوار بارش میں بھیگتا ہُوا آیا۔ اُس نے بھی اپنا چہرہ کالے نقاب میں چُھپا رکھا تھا۔ گھوڑا باہر باندھ کر وہ بھی قلعے میں داخل ہو گیا۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک سات گھڑ سوار آئے اور اپنے اپنے گھوڑے باہر باندھ کر قلعے میں داخل ہو گئے۔

قلعے کے نیچے ایک چھوٹا سا ہال کمرا تھا جس کی دیواروں کے ساتھ لٹکی ہُوئی لالٹینیں جل رہی تھیں۔ فرش پر کُرسیاں لگی تھیں۔ یہ ساتوں کے ساتوں نقاب پوش آدمی اِس چھوٹے سے ہال کمرے میں آ کر کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ بالکل خاموش تھے اور ایک دُوسرے سے کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ اِن کے سامنے ایک اسٹیج بنا ہُوا تھا۔ اسٹیج پر ساتھ ساتھ دو اسٹریچر پڑے تھے۔ یہ اسٹریچر اُسی طرح کے تھے جس طرح کے ہسپتالوں میں لاشیں لے جانے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ قلعے کے باہر جو مُوسلا دھار بارش ہو رہی تھی، اُس کی ہلکی ہلکی آواز اندر آ رہی تھی۔ کسی وقت بادل گرجنے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ ساتوں نقاب پوش کُرسیوں پر بالکل سیدھے خاموش بیٹھے تھے۔ اِن کی نظریں سامنے

اسٹیج پر رکھے لاشوں والے اسٹریچروں پر لگی تھیں۔

اتنے میں وہی شکاری جو کامران کو ورغلا کر قلعے میں لایا تھا، اسٹیج پر نمودار ہُوا۔ اب اُس نے بھی اپنے چہرے کو کالے نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ اسٹیج پر آکر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے ایک نظر کمرے میں خاموش بیٹھے نقاب پوش مہمانوں پر ڈالی اور کہا :

"خونی کلب کے ممبرو! میں آپ کو اس مہینے کے خونی کھیل میں تشریف لانے پر خوش آمدید کہتا ہُوں۔ جیسا کہ آپ دوست جانتے ہیں، خونی کلب کی طرف سے اس قلعے میں ہر مہینے کی ایک رات خونی کھیل رچایا جاتا ہے۔ اس خونی کھیل میں ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کو زندہ اسٹریچروں پر لٹا کر اُن کے جسم کی چھُریوں سے چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔ اُن کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے۔ میرے دو جلّاد پہلے تیز آریوں سے اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر الگ کرتے ہیں، پھر چھُریوں سے اُن کے پیٹ پھاڑ کر انتڑیاں باہر نکال کر شیشے کے مرتبانوں میں رکھ دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد اُن کے سینے چیر کر اُن کے دھڑکتے ہوئے دل نکال کر طشت میں رکھ کر آپ سب لوگوں کو دکھائے جاتے ہیں تاکہ آپ اس سے لُطف اندوز ہوں۔ لڑکی اور لڑکے کی بھیانک چیخوں سے آپ خوش ہوتے ہیں۔ پھر اُن کا تازہ خون پیالے میں ڈال کر آپ کو پلایا جاتا ہے۔ اس کے عوض آپ میں سے ہر ایک مجھے تین تین ہزار رُوپے ادا کرتا ہے۔ اس زندہ خونی کھیل کے لیے یہ رقم کچھ زیادہ نہیں ہے۔

"آج بھی میں نے آپ کی تفریح کے لیے ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کے جسموں کی چیر پھاڑ کا انتظام کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے جلّادوں کو بُلا کر یہ خونی کھیل شروع کروں، میں چاہوں گا کہ آپ اپنی فیس ابھی ادا کر دیں جس طرح کہ آپ ہر مہینے ادا کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر شکاری اسٹیج سے نیچے اُتر آیا۔ وہ ہر تماشائی کے پاس جاتا، اس سے تین ہزار روپے کے نوٹ وصول کرتا اور اگلے شکاری کی طرف بڑھ جاتا۔ یُوں جب اُس نے ساتوں تماشائیوں سے رقم وصول کر لی تو اسٹیج پر آکر کہنے لگا:

"خونی کلب کے ممبرو! تیار ہو جاؤ۔ خونی کھیل شروع ہونے والا ہے۔ ہمارے آج کے دونوں شکار یعنی لڑکا اور لڑکی ہوش میں آچکے ہیں اور میرے آدمی انھیں ابھی یہاں لا رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی دو جلّاد اسٹیج پر نمودار ہُوئے۔ انھوں نے بھی اپنے چہرے کالے نقابوں میں ڈھانپے ہُوئے تھے۔ وہ ایک چھوٹا سا پہیّوں والا میز اپنے ساتھ

لائے تھے۔ میز پر چیر پھاڑ کرنے والے اوزار رکھے تھے جن میں چمکتی ہُوئی تیز چھُریاں اور آریاں تھیں۔ شیشے کے دو خالی مرتبان تھے۔ چار پیالے تھے۔ یہ میز جلّادوں نے اسٹریچروں کے درمیان لا کر رکھ دیا اور خود چیر پھاڑ کے لیے بالکل تیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ شکاری نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر بلند آواز میں کہا :

"لڑکی اور لڑکے کو لایا جائے۔"

ہال میں خاموشی تھی۔ خُونی کلب کے ممبر شوق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں اسٹیج کے پیچھے سے کامران اور لڑکی کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ وہ بلند آوازیں پکار رہے تھے "تم ہمیں کہاں لیے جا رہے ہو؟ ہمیں چھوڑ دو۔ ہمیں چھوڑ دو۔" اس کے ساتھ ہی اسٹیج کے پیچھے جو کالا پردہ لگا تھا، وہ اُٹھا اور دو ہٹے کٹے نقاب پوش آدمی کامران اور دُوسری بدقسمت لڑکی کو اس حالت میں لے کر اسٹیج پر آئے کہ ان دونوں کے ہاتھ پیچھے بندھے ہُوئے تھے اور اُنھیں زبردستی دھکیل کر آگے لایا جا رہا تھا۔ لڑکی کے بال کھُلے تھے، رنگ اُڑا ہُوا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتے ہُوئے کہ رہی تھی :

"مجھے گھر جانے دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟"

کامران بھی پریشان تھا۔ جب اُس نے اسٹیج پر ہسپتالوں والے دو اسٹریچر اور میز پر رکھی چھُریاں اور آریاں دیکھیں تو اُس کا دل ایک دم بیٹھ سا گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اُس کا آخری وقت آگیا ہے۔ اس کو دھوکے سے یہاں قتل کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ اُس نے شکاری کو نقاب میں بھی پہچان لیا اور عاجزی سے کہا:

"انکل، آپ تو مجھے اپنا بیٹا کہتے تھے۔ پھر یہ ظلم میرے ساتھ کیوں کر رہے ہیں؟"

قاتل شکاری نے سنگ دلی سے کہا "میرے عزیز، یہ تو ہمارا خونی کھیل ہے
تم ہمارے خونی کھیل کے ہیرو ہو۔ یہ لڑکی اس کھیل کی ہیروئن ہے۔"

خونی کلب کے ممبروں نے زور سے تالیاں بجائیں اور پھر چیخ چیخ کر کہنے لگے
"خونی کھیل شروع کرو۔ ہمیں ان کا خون پلاؤ۔ ہمیں ان کے زندہ دھڑکتے ہوئے
دل دکھاؤ۔ ہمیں ان کی انتڑیاں دکھاؤ۔"

یہ سُنتے ہی لڑکی نیم بے ہوش سی ہوگئی۔ جلادوں نے جلدی سے اُسے اسٹریچر
پر لٹا کر اُس کے جسم کو چمڑے کی پٹی سے باندھ دیا۔ کامران کی آنکھوں میں موت بھر
گئی۔ اب وہ پچھتانے لگا کہ وہ ایک اجنبی کی باتوں میں آکر اُس کے ساتھ کیوں
چل پڑا۔ کاش! وہ اِس منحوس قلعے میں داخل ہی نہ ہوتا۔ مگر اب وقت گزر گیا تھا۔
یہ اُسے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ کسی اجنبی کے ساتھ کہیں نہیں جانا چاہیے۔ اُسے
اپنے پُراسرار نقاب کا خیال آگیا۔ اگر اس وقت اُس کے پاس وہ نقاب ہوتا تو
یہاں کا نقشہ بدل سکتا تھا اور ان سب قاتل اور خونیوں کو رسیوں سے باندھ کر
قانون کے حوالے کر سکتا تھا۔ لیکن نقاب اُس کے پاس نہیں تھا اور اُس کا ساتھی
اور دوست ناگ بھی خدا جانے کہاں تھا۔

کامران کو جلادوں نے زبردستی کھینچ کر دوسرے اسٹریچر پر ڈالا اور اُس کی
ٹانگوں اور سر پر چمڑے کی پٹی باندھ دی۔ کامران کی آنکھوں میں اپنے ماں باپ اور
بہن کی شکلیں گھوم گئیں۔ اب اُسے اللہ کے سوا کوئی موت سے نہیں بچا سکتا تھا۔
فریاد کرنا، رونا، شور مچانا بے کار تھا۔ خوب صورت لڑکی نیم بے ہوشی کی حالت
میں کراہ رہی تھی "مجھے جانے دو۔ امی! ابو! مجھے بچالو! مجھے بچالو!"

کامران نے دل میں کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ موت کا وقت آگیا تھا۔
جلادوں نے چھریاں پتھر کے ٹکڑے پر تیز کرنی شروع کر دیں۔ شکاری نے خونی کلب
کے ممبروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"خونی کلب کے ممبرو! خونی کھیل شروع ہونے والا ہے۔ سب سے پہلے
لڑکی کے پاؤں آری سے کاٹے جائیں گے پھر اس کا پیٹ چاک کر کے اس کی
انتڑیاں نکال کر شیشے کے مرتبان میں ڈال دی جائیں گی۔ پھر اس کا دھڑکتا ہوا دل
طشت میں رکھ کر آپ کو دکھایا جائے گا۔ اس کا خون پیالے میں ڈال کر آپ کو
پلایا جائے گا۔ اس کے بعد لڑکے کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔"

بے چاری لڑکی نے جب یہ سُنا کہ اُس کے ساتھ درندوں والا سلوک
ہونے والا ہے تو اُس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اُس کی چیخ سُن کر ہال میں بیٹھے
لوگوں نے تالیاں بجائیں اور ایک آواز ہو کر کہا "لڑکی کا پیٹ چاک کیا جائے۔"

کامران نے آنکھیں بند کر لیں "یا خدا! یہ کس قسم کے ظالم لوگ ہیں! یہ
انسان نہیں ہیں، حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔ یہ جلادوں سے بھی زیادہ مکروہ لوگ
ہیں۔ یا اللہ! ان کو ان کے ظلم کی سزا دے اور ہمیں ان ظالموں کے پنجے سے
چھڑا دے۔" یہ دعا کامران اپنے دل میں مانگ رہا تھا۔

دوسری طرف ایک جلاد نے آری پکڑی اور بدقسمت لڑکی کے اسٹریچر
کے پاس آگیا۔ اُس نے لڑکی کی شلوار کے پائنچے ذرا اوپر کیے اور جب لڑکی کا
ٹخنا اُسے نظر آنے لگا تو اُس نے آری والا ہاتھ اوپر اُٹھا کر بلند آواز میں کہا:

"میں لڑکی کا پہلا ٹخنا کاٹنے لگا ہوں۔"

اِس کے ساتھ ہی بدنصیب لڑکی نے ایک دل دوز چیخ ماری اور روتے
ہوئے کہا "میرا پاؤں نہ کاٹو! میرا پاؤں نہ کاٹو!"

جلاد نے آری کے دندانے لڑکی کے ٹخنے پر رکھ دیے۔ وہ آری چلانے
ہی لگا تھا کہ اچانک اسٹیج پر اوپر چھت پر سے دو سبز سانپ دونوں جلادوں
کے اوپر گرے۔ جلاد گھبرا کر پیچھے ہٹے مگر سبز سانپوں نے دونوں جلادوں کو ڈس
لیا تھا۔ یہ وہی سبز سانپوں کا جوڑا تھا جو کامران کا تعاقب کر رہا تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ ناگ سانپوں کا دیوتا تھا اور ناگ کا دوست ہونے
اور اُس کے ساتھ رہنے کی وجہ سے کامران کے جسم سے بھی ناگ دیوتا کی خوش بو
آنے لگی تھی۔ جب کامران بوندا باندی میں ٹیلوں کے پاس سے گزر رہا تھا تو
سبز سانپوں کا یہ جوڑا ناگ دیوتا کی خوش بو پا کر اُسے سلام کرنے آیا تھا۔ کیوں کہ
ناگ دیوتا کے آگے اور جس کے جسم میں سے ناگ دیوتا کی خوش بو آ رہی ہو، اُس

کے آگے، ادب سے سر جھکانا اور اُس کی حفاظت کرنا سانپوں کا فرض ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سبز سانپوں کے جوڑے نے کامران کے سامنے آکر اُسے بار بار سر جھکا کر سلام کیا تھا۔ اُنھوں نے سانپوں کی زبان میں، کامران سے بات بھی کی تھی اور اُس کی خیریت بھی پُوچھی تھی لیکن جب کامران نے سانپوں کی زبان میں جواب نہ دیا تو سانپ سمجھ گئے کہ یہ اگرچہ ناگ دیوتا نہیں ہے مگر ناگ دیوتا کا بھائی ضرور ہے۔ کیوں کہ اِس کے جسم سے بھی ناگ دیوتا کی مہک آرہی تھی۔ کامران نے ڈر کر سانپوں کو بھگانے کوشش کی لیکن سانپوں کا جوڑا چھُپ کر اُس کا تعاقب کرتا رہا۔ کیوں کہ ناگ دیوتا کے بھائی کی حفاظت اب اِس جوڑے کا فرض بن چُکا تھا۔ جب سانپوں کے جوڑے نے دیکھا کہ قلعے کے اندر بہت سے آدمی ناگ دیوتا کے بھائی کو باندھ کر چھُریوں سے ہلاک کرنے والے ہیں تو اُنھوں نے ایک خفیہ آواز نِکال کر علاقے کے سارے سانپوں کو قلعے کے اندر بُلا لیا تھا۔

چُناں چہ جب جلّاد لڑکی کے پاؤں کاٹنے لگا تو اُس وقت اِسٹیج کی چھت کے ساتھ چار سانپ چمٹے ہُوئے تھے، جن میں سبز سانپوں کا جوڑا بھی تھا۔ باقی سانپ ہال کمرے میں سنگ دِل تماشائیوں کے بالکل اُوپر چھت کے ساتھ چمٹے ہُوئے تھے اور سبز سانپوں کے جوڑے کی خفیہ پھُنکار کا انتظار کر رہے تھے۔ سبز سانپوں کے جوڑے نے جلّادوں پر چھلانگ لگانے سے پہلے خُفیہ پھُنکار کا سگنل دے دیا تھا۔ اِس سگنل کی آواز سُنتے ہی ہال کمرے کی چھت سے چمٹے ہُوئے سانپوں نے بھی کُرسیوں پر بیٹھے وحشی اور خونی تماشائیوں پر ایک ساتھ چھلانگیں لگادیں۔ وہ اُن کی گردنوں سے لپٹ گئے اور اِس سے پہلے کہ وہ لوگ اپنا بچاؤ کرتے، سانپوں نے پھن اُٹھا کر اُن کے چہروں پر کئی بار ڈسا۔ یہ بڑے ہی زہریلے سانپ تھے۔ اگر وہ ایک بار ڈس لیں تو آدمی کا زندہ بچنا ناممکن ہوتا ہے۔ جب کہ ساتوں کے ساتوں تماشائیوں کو سانپوں نے کئی کئی بار ڈسا تھا۔ سارے خُونی تماشائی کُرسیوں پر گِر پڑے، اِن کے جسموں کی رگیں پھٹ گئیں اور خون کالا اور گاڑھا ہو کر بہنے لگا۔

اِسٹیج پر بھی دونوں جلّادوں کا یہی حال ہُوا۔ سبز سانپوں کے جوڑے نے دونوں جلّادوں کی گردنوں میں لپٹ کر اُنھیں چار چار بار ڈسا تھا۔ جلّاد اِسٹیج پر گِر پڑے۔ اُن کے جسم بھی دیکھتے دیکھتے پھٹ گئے اور کالا خون بہنا شروع ہو گیا۔ قاتل شکاری نے جب یہ دیکھا کہ سانپوں کی بارش شروع ہو گئی ہے تو وہ اِسٹیج کے دروازے کی طرف بھاگا۔ مگر ایک سانپ اِسٹیج پر سے اُچھلا اور ہوا میں اُڑا۔ یہ اُڑنے والا سانپ تھا اور اُس نے بھاگتے ہُوئے شکاری کی گردن کے پیچھے ڈسا۔ سانپ کا زہر ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں شکاری کے خُون میں شامل ہو گیا۔ شکاری گِرا۔ سانپ نے اِسے دُوسری بار ڈسا۔ اب شکاری کے خُون کے تمام سُرخ ذرّات تباہ ہو گئے۔ رگیں پھٹ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس کا جسم بھی جیکٹ کے اندر پھٹنے لگا۔ آنکھیں نقاب میں سے اُبل کر باہر آگئیں۔ سارا لباس کالے خُون میں تربتر ہو گیا اور لباس کے اندر سے خُون اور گوشت کے چھوٹے چھوٹے لوتھڑے باہر نِکل نِکل کر گِرنے لگے۔

کامران اور لڑکی اسٹریچروں پر لیٹے یہ دہشت ناک منظر دیکھ رہے تھے۔ ہلکی روشنی کی وجہ سے کامران کو ابھی تک یہ عِلم نہیں ہُوا تھا کہ یہ کام سبز سانپوں کے اُسی جوڑے نے کیا ہے جو اُس کا پیچھا کر رہا تھا اور جسے اُس نے پتھر مار کر

بھگانے کی کوشش کی تھی۔ اِتنے میں سبز سانپ نے خفیہ پھنکار کا ایک دُوسرا سگنل دیا۔ سارے سانپ اسٹیج پر آکر ایک طرف قطار میں کُنڈلی مار کر بیٹھ گئے۔ اب سبز سانپوں کا جوڑا کامران کے اسٹریچر کے پاس آگیا۔ اُن میں سے نر سانپ زمین پر سے چار فٹ بلند ہُوا، پھن کھول کر کامران کے قریب آیا اور پھن کو بار بار جُھکانے لگا۔ لالٹینوں کی روشنی میں کامران نے سبز سانپ کو پہچان لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اللہ کے حُکم سے یہ سانپ اُس کی مدد کو بھیجے گئے تھے۔ اُس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ رسّی سے آزاد کیے۔ پھر اپنے سر اور ٹانگوں کے گرد لپٹی ہُوئی چمڑے کی پٹی کے بکسوئے کھولے اور اسٹریچر سے نیچے اُتر آیا۔ اُس نے جلدی سے لڑکی کو بھی آزاد کیا اور کہا :

”بہن ! گھبراؤ نہیں۔ اللہ نے ہمیں بچا لیا ہے۔“ بے چاری لڑکی کا رنگ زرد تھا۔ وہ خوف سے ابھی تک کانپ رہی تھی۔ اسٹیج پر دونوں جلّادوں اور قاتل شکاری کی پھٹی ہُوئی لاشیں اِس حالت میں پڑی تھیں کہ اُن کے چہرے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ ہال میں کُرسیوں پر ساتوں خونی کلب کے ممبروں کی پھٹی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ اِن لاشوں نے اب پُھولنا شروع کر دیا تھا۔ اسٹیج پر، ایک طرف پندرہ بیس سانپ کُنڈلی مارے بیٹھے تھے اور کامران کی طرف مُنھ کر کے بار بار تعظیم میں اپنے پھن جھکا رہے تھے۔ لڑکی اِن سانپوں سے ڈر کر کامران کے ساتھ لگی کانپ رہی تھی۔ کامران نے اُسے حوصلہ دیتے ہُوئے کہا :

”حوصلہ رکھو، بہن ! یہ ہمارے دوست ہیں۔“ پھر اُس نے سبز سانپوں کے جوڑے کی طرف مُخاطب ہو کر کہا :

”تمھارا شکریہ، دوستو ! اللہ تعالیٰ نے تمھیں ہماری جان بچانے کے لیے بھیجا تھا۔ اب تم چلے جاؤ، کیوں کہ ہمیں بھی قلعے سے باہر جانا ہے۔“

سبز سانپوں کے جوڑے نے کامران کے آگے آخری بار اپنے پھن جُھکائے اور اسٹیج کے چھوٹے سے دروازے کی طرف رینگنے لگے۔ اُنھیں باہر جاتا دیکھ کر باقی سانپوں نے بھی ادب سے کامران کو پھن جُھکا کر سلام کیا اور سبز سانپوں کے پیچھے پیچھے رینگتے ہُوئے اسٹیج کے دروازے میں سے نِکل گئے۔ کامران کو قاتل شکاری جس راستے سے اِس منحوس قلعے میں لایا تھا، وہ اُس راستے کو جانتا تھا۔ اُس نے خوف زدہ لڑکی کو ایک بار پھر تسلّی دی اور ساتھ لے کر اسٹیج کے دروازے سے دُوسری طرف نکل کر اُونچی کالی دیواروں والی راہ داری میں آگیا۔ یہاں کوئی لالٹین نہیں جل رہی تھی۔ چلتے چلتے بائیں جانب وہ کوٹھڑیاں نظر پڑیں جن میں سے ایک میں کامران اور دُوسری میں نوجوان لڑکی کو لا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔ کامران یہاں سے ایک تنگ راستے سے گزرتا ہُوا منحوس قلعے کی ڈیوڑھی میں آگیا۔ اُسے اُس زرد چہرے والے آدمی کا خیال آ رہا تھا جس نے سلاخوں کے پیچھے نمُودار ہو کر اُس کو وہاں سے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا، لیکن اُس نے یہ مشورہ غلط وقت پر اور غلط جگہ پر دیا تھا۔ اُس وقت کامران کمرے میں بند ہو چُکا تھا۔

ڈیوڑھی کے آگے قلعے کا پُرانا دروازہ تھوڑا سا کُھلا تھا۔ باہر سے بارش کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کامران لڑکی کو ساتھ لیے قلعے سے باہر آگیا۔ بادلوں والی رات کی ٹھنڈی اور تازہ ہوا میں آنے سے کامران کو آزادی اور نئی زندگی کا احساس ہُوا۔ خُدا نے سچ مُچ اُسے نئی زندگی عطا کی تھی۔ اگر عین وقت پر سانپ اُس کی مدد کو نہ آجاتے تو اِس وقت دونوں کی کٹی پھٹی لاشیں قلعے کے اندر اسٹریچروں پر پڑی ہوتیں۔ کامران نے لڑکی سے پُوچھا :

”بہن، تمھارا نام کیا ہے اور تم کس گاؤں کی رہنے والی ہو ؟“

لڑکی ابھی تک سہمی ہُوئی تھی، جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو کہ وہ موت کے مُنھ سے نکل کر آئی ہے۔ کامران نے اُسے تسلّی دیتے ہُوئے کہا :

”اب گھبرانے کی کوئی ضرُورت نہیں ہے۔ میں تمھیں تمھارے گھر چھوڑ کر لاہور جاؤں گا۔“

لڑکی نے بتایا کہ اُس کا گاؤں جہلم جانے والی بڑی سڑک کے قریب ہی ہے۔ باہر گھوڑے ابھی تک بندھے ہُوئے تھے۔ کامران نے لڑکی کو سہارا دے کر ایک گھوڑے پر بٹھایا، خود دُوسرے گھوڑے پر بیٹھا اور قلعے سے آگے جاتی ہُوئی چھوٹی سی کچّی پگ ڈنڈی پر روانہ ہو گیا۔ آسمان بادلوں میں چھپا ہُوا تھا جس کی وجہ سے

رات زیادہ اندھیری ہوگئی تھی۔ پھر بھی وہ اندازے سے جنوب کی طرف چلتا گیا۔ لڑکی نے اپنا نام بانو بتایا تھا۔ کامران نے اُس سے پوچھا:

"کیا تمھیں راستے کا کچھ پتا ہے، بانو؟ کیوں کہ اِدھر سے تو نالے کا پُل ٹوٹا ہُوا ہے۔"

لڑکی نے کامران کو بتایا کہ وہاں سے مشرق کی طرف لکڑی کا ایک دُوسرا پُل بھی ہے۔ کامران نے اُس طرف گھوڑا ڈال دیا اور آخر رات کے اندھیرے میں راستہ تلاش کرتے کرتے وہ کسی نہ کسی طرح جہلم جانے والی بڑی سڑک پر پہنچ گئے۔ کامران نے لڑکی کو جب اُس کے غریب ماں باپ کے پاس پہنچایا تو وہ خوشی سے نہال ہوگئے۔ دو روز سے اُن کی بیٹی غائب تھی۔ غریب ماں باپ نے اپنی عزت کی خاطر کسی کو بتایا تک نہیں تھا۔ گاؤں والوں سے یہی کہا تھا کہ وہ اپنی خالہ کے گھر جہلم گئی ہوئی ہے۔ یہاں سے رُخصت ہوکر کامران سیدھا جہلم شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کی جیب میں صرف دس پندرہ روپے تھے۔ جب رات کے تین بجے تو اُسے سڑک پر لاہور جانے والی ایک بس مل گئی وہ بس میں بیٹھا اور لاہور کی طرف چل پڑا۔

لاہور پہنچتے پہنچتے صبح ہوگئی تھی۔ کامران سب سے پہلے سیدھا اپنے گھر گیا۔ گھر والے اُس کے لیے سخت پریشان تھے۔ اُس نے بتایا کہ اُسے کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے۔ بڑی مشکل سے اُن سے جان بچا کر بھاگا۔ اُس نے کھانا کھایا اور سوگیا۔ وہ دو گھنٹے تک سویا رہا۔ پھر اُٹھ کر کپڑے بدلے اور ناگ سے ملنے اُس کے ہوٹل چلا گیا۔ ناگ بھی اُس کے لیے بے چین تھا۔ اُس نے کامران کو گلے سے لگایا۔ کامران نے جب اپنی بھیانک داستان سُنائی تو ناگ نے کہا:

"سبز سانپوں کے جوڑے نے تمھیں بچالیا۔ اِس کا مطلب ہے کہ تمھارے جسم سے میری خوش بُو آنے لگی ہے۔ میں ناگ دیوتا ہوں اس لیے ہر سانپ اب تمھارا احترام کرے گا اور مشکل کے وقت تمھارے کام آئے گا۔"

پھر ناگ نے کامران کو بتایا کہ شیطانی مُردہ اُس کا پُراسرار نقاب لے کر کہیں غائب ہوگیا ہے۔ یہ سُن کر کامران اُداس ہوگیا۔ ناگ کہنے لگا: "مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں آج رات یہاں سے دُوسرے مُلک عنبر، ماریا کی تلاش میں جارہا ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے تمھاری مُلاقات راگنی ناگن سے کرانا چاہتا ہوں۔ میرے بعد تمھارا نقاب تلاش کرنے میں وہ تمھاری مدد کرے گی۔ میرے ساتھ شہر کے پُرانے قبرستان میں آؤ۔ راگنی ناگن اُسی قبرستان کی ایک پُرانی قبر میں رہتی ہے۔"

اور ناگ اُسی وقت کامران کو لے کر شہر کے پُرانے قبرستان کی طرف چل دیا۔

اس کے بعد کیا ہُوا؟

یہ معلوم کرنے کے لیے "پُراسرار نقاب پوش" کی اگلی کہانی تعلیم و تربیت کے آیندہ شمارے میں پڑھنا مت بھولیے گا۔

ماں کا درجہ

جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

(آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم)

دُنیا کی تمام خوشیاں پیار سے "ماں" کہتے ہی مل جاتی ہیں۔

(امام رازیؒ)

دُنیا کی سب سے بڑی ہستی ماں اور صرف ماں ہے۔

(مولانا محمد علی جوہر)

مجھے پھول اور ماں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ دونوں ایک جیسے خوب صورت ہیں۔ (نادر شاہ)

بچے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہے۔ بے شک اُس بچے کی عمر کتنی ہی ہو۔ (شیکسپیئر)

سخت سے سخت دِل بھی ماں کی آنسو بھری آنکھوں سے موم ہو جاتا ہے۔ (نامعلوم)

آسمان کا آخری اور بہترین تُحفہ ماں ہے۔ (مِلٹن)

جوابات دِل چسپ چکّے

(1) گلاس نمبر 4 کا پانی گلاس نمبر 1 میں ڈال دیجیے اور گلاس نمبر 4 کو اُسی جگہ رکھ دیجیے جہاں وہ رکھا ہُوا تھا۔ (2) امی بازار گئی ہیں۔ (3) 16 (4) شکیل کے تھیلے خالی ہیں۔ (5) وسیم کے 10 سوال صحیح تھے اور 16 غلط۔ (6) اُوپر والے کارڈ کو اتنا اُوپر لے جائیے کہ کارڈوں کی درمیان کی خالی جگہ مُربع بن جائے (7) دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں اور بڑی اُنگلیوں سے نوٹ کو آہستہ آہستہ رول کیجیے، اور اُسے اپنی طرف کھسکاتے جائیے۔

سجاد احمد 15 سال
سکے جمع کرنا، کرکٹ
مکان نمبر 1/2 لیاقت روڈ
میاں چنوں۔

سید حیدر علی 9½ سال
سائیکل چلانا، مطالعہ
35-بی - میڈیکل کالونی
بہاول پور۔

سید نجم احمد 14 سال
ٹکٹ جمع کرنا
5/875 لیاقت آباد۔
کراچی نمبر 19

مُدثر رفیق 11 سال
سکواش کھیلنا
کوچہ یوسف علی خان شاہ
بُرہان روڈ، پشاور شہر۔

علی رضا شاہ 11 سال
کرکٹ، مُطالعہ
محمد اشرف شاہ محلّہ راجا
پارک ٹوبہ۔

سعد اسلام 7 سال
کرکٹ، ہاکی
396/D سیٹلائٹ
ٹاؤن راولپنڈی۔

جاوید اکبر علی خواجہ 17 سال
کرکٹ۔
مکان نمبر 114، ٹنڈو ولی محمد
(سندھ)

محمد علی 15 سال
کرکٹ، مُطالعہ
مکان نمبر 244، ایریا 2/c
لانڈھی 3½ کراچی۔

محمود امتیاز 11 سال
پڑھنا اور کھیلنا
نئی آبادی مین سٹریٹ،
جلال پور جٹاں (گجرات)

شعیب ملک 10 سال
سکے جمع کرنا
619۔ کامران بلاک، علامہ
اقبال ٹاؤن لاہور۔

نجم الدین ظہیر 15 سال
دینی علوم
مدرسہ تعلیم الاسلام گلشن عمر بلاک
نمبر 20، کراچی نمبر 38

امجد محمود 15 سال
مطالعہ، ٹکٹ جمع کرنا
انجینئر عبدالغفور (مرحوم) بھاڑا گیٹ
نمبر 13 محلّہ بایان باڑا روڈ پشاور۔

مرزا کلیم 14 سال
قلمی دوستی
بلاک بی، مکان نمبر 108
ڈیرہ غازی خان۔

غفار 13 سال
کرکٹ
پھلیلی الفضل ٹاؤن مکان
نمبر 157 - حیدر آباد۔

اختر حسین کاظمی 15 سال
شعر و شاعری
جیلانی بک سٹور نزد گورنمنٹ ہائی سکول
نمبر 4 سیدو شریف روڈ ڈنگورہ (سوات)

محمد مسعود یوسف 16 سال
مُصوری، بیڈمنٹن
ڈاکٹر محمد یوسف مقام و ڈاکخانہ
لاوہ تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال

آصف علاء الدین 12 سال
اسکاؤٹنگ
اے۔بی۔سی فلیٹس 24-A
LV-C-2 ناظم آباد نمبر 4 کراچی۔

ثاقب رشید 15 سال
فٹ بال اور کرکٹ
مکان نمبر 800/A آریہ
بازار، راولپنڈی۔

محمد عمران 15 سال
ٹکٹ اور سکے جمع کرنا
88/c سیٹلائٹ ٹاؤن
سرگودھا۔

کمال عباس 13 سال
ٹکٹ جمع کرنا۔
پوسٹ بکس نمبر 9 مظفر آباد
آزاد کشمیر۔

عامر حمید ملک 11 سال
کرکٹ، مطالعہ
290 عمر بلاک علامہ اقبال
ٹاؤن لاہور۔

وسیم قریشی 11 سال
مُطالعہ
116 - ہیبی ٹاٹ شادمان
11 جیل روڈ لاہور۔

محبوب الحق 14 سال
کرکٹ۔
طارق کالونی شمسی روڈ
ضلع مردان۔

قلمی دوستی کی اس محفل میں شریک ہونے کے لیے
یہ کوپن پُر کرنا اور تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں۔)

آئیے دوست بنائیں
جنوری: 1989

نام ______ عمر ______
مشاغل ______
پتا ______
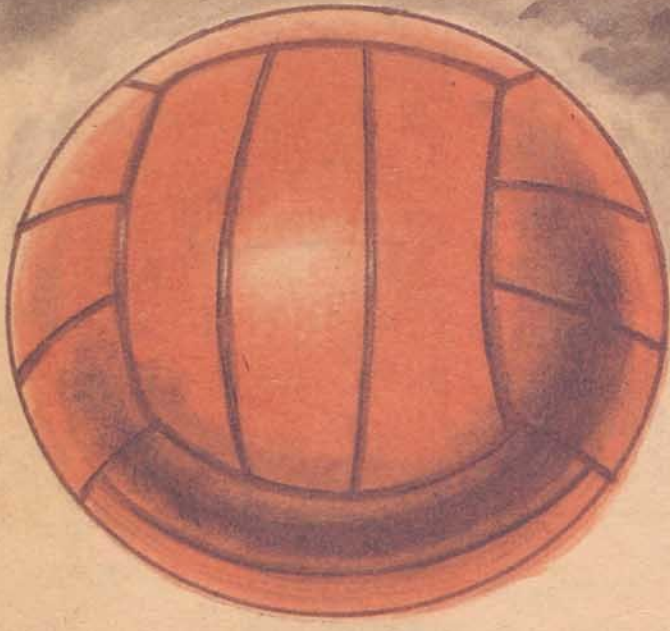
والی بال

سید توقیر حسین شاہ

پچھلے دنوں آپ نے ٹی وی پر سیول اولمپک کھیل دیکھے ہوں گے۔ ان کھیلوں میں جہاں جمناسٹک، پیراکی، باکسنگ وغیرہ نے تماشائیوں کو تفریح کا سامان فراہم کیا، وہاں اُنھوں نے ایک اور کھیل سے بھی بہُت لُطف اُٹھایا۔ یہ کھیل تھا والی بال، جس کے کھلاڑیوں کی پھُرتی قابلِ داد تھی۔ آئیے آج ہم آپ کو اس کھیل کے بارے میں بتائیں۔

والی بال کا کھیل 1895 میں امریکی ریاست مساچوسیٹس کے شہر ہالی اوک میں ولیم جی۔ مارگن نامی ایک شخص نے ایجاد کیا۔ اُس وقت اِس کھیل کا نام منونیٹ تھا، جو بعد میں والی بال کے نام سے مشہور ہوا۔ مارگن وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کلب کے جمنازیم میں جسمانی تربیت کا اُستاد تھا۔ اس کلب کے ممبروں میں بہُت سے لوگ اُدھیڑ عُمر کے تھے اور وہ ایسے کھیل نہیں کھیل سکتے تھے جن میں بہُت زیادہ پھُرتی یا قوتِ برداشت (اسٹمنا) کی ضرورت ہوتی ہے۔ چناں چہ ایسے لوگوں کی ورزش اور دل چسپی کے لیے مارگن نے یہ کھیل ایجاد کیا۔ ابتدا میں تو اِس کھیل میں باسکٹ بال کی گیند استعمال کی جاتی تھی مگر بعد میں ایک خاص گیند بنائی گئی جو باسکٹ بال کی گیند کے مقابلے میں چھوٹی ہوتی ہے اور اس کا رنگ سفید ہوتا ہے۔

ولیم جی مارگن نے 1897 میں اِس کھیل کے اصُول اور قاعدے بنائے جن میں 1916 میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ 1922 میں پہلی مرتبہ اِن نئے قوانین کے تحت امریکا میں قومی کھیل منعقد ہوئے۔

امریکا میں مردوں کی والی بال ایسوسی ایشن 1929 میں اور خواتین کی والی بال ایسوسی ایشن 1945 میں قائم ہوئی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران یہ کھیل امریکی فوجیوں کے ذریعے دُنیا کے دیگر مُلکوں میں پہنچا اور بہُت مقبول ہوا۔ اپریل 1947 میں فرانس کے دارُالحکومت پیرس میں انٹرنیشنل والی بال ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ اِس کے تحت پہلے مردوں کے عالمی مُقابلے 1949 میں اور خواتین کے عالمی مُقابلے 1952 میں مُنعقد ہوئے۔ اور جب 1964 میں جاپان کے شہر ٹوکیو میں اولمپک کھیل ہوئے تو والی بال کو بھی اولمپک کھیلوں میں شامل کر لیا گیا۔ گو یہ ایک خالص امریکی کھیل ہے مگر اب اِس میں رُوس، چین، جاپان، ہنگری، برازیل، ارجنٹائن وغیرہ نے بھی بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

والی بال کے کورٹ کی لمبائی 60 فٹ اور چوڑائی 30 فٹ ہوتی ہے۔ کورٹ عام طور پر سیمنٹ کے ہوتے ہیں۔ مگر اچھے کورٹ پالش شدہ لکڑی سے بنائے جاتے ہیں۔ جن پر خوب صورت رنگ و روغن کیا جاتا ہے۔ 60 فٹ لمبائی کے بالکل بیچوں بیچ دو پولوں کی مدد سے نیٹ کھڑا کیا جاتا ہے۔ اِس نیٹ کی اُونچائی مردوں کے لیے 7 فٹ 11½ انچ اور خواتین کے لیے 7 فٹ 4¼ انچ ہوتی ہے۔ یہ میچ دو ٹیموں کے درمیان ہوتا ہے اور ہر ٹیم میں کھلاڑیوں کی تعداد 6 ہوتی ہے۔ جو ٹیم ٹاس جیت جاتی ہے، اُس کے کھلاڑی سروس کرتے ہیں۔ سروس کا طریقہ یہ ہے کہ کھلاڑی اپنے کورٹ کے باہر سے گیند کو اِس طرح ہاتھ سے ضرب لگاتا ہے کہ وہ مخالف ٹیم کے حصّے میں جا کر گرے۔ اگر گیند مخالف ٹیم کے حصّے سے باہر چلی جائے گی یا نیٹ میں لگے گی تو سروس تبدیل ہو جائے گی اور مخالف ٹیم سروس کرے گی۔ اگر سروس ٹھیک ہو تو مخالف ٹیم کے کھلاڑی گیند کو ضرب لگا کر واپس مخالف ٹیم کی طرف پھینکیں گے۔ جو ٹیم گیند واپس نہ کر سکے گی یا اُس

کے کِسی کھلاڑی کے ہاتھ سے ٹکرا کر گیند باہر جا گرے گی تو مخالف ٹیم کو پوائنٹ مِلے گا۔ اگر گیند نیٹ سے لگ کر آئے تو نیٹ کے پاس کھڑا کھلاڑی اُس کو اُٹھائے گا۔ مگر ضرب کوئی دُوسرا لگائے گا۔ ایک کھلاڑی لگاتار دو مرتبہ گیند کو نہیں چھو سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو مخالف ٹیم کو پوائنٹ مِل جائے گا

اگر گیند نیٹ کے اُوپر سے آرہی ہو اور کِسی ٹیم کے کھلاڑی نے اُس کو اِس طرح کھیلا کہ اُس کا ہاتھ نیٹ کی دُوسری طرف چلا گیا یا نیٹ پر لگ گیا تو مخالف ٹیم کو پوائنٹ ملے گا۔

والی بال کا ایک گیم 15 پوائنٹ کا ہوتا ہے۔ یعنی جو ٹیم پہلے پندرہ پوائنٹ حاصل کرلے، وہ جیت جائے گی۔ اگر دونوں ٹیموں کے پوائنٹ پندرہ پندرہ ہو جائیں تو ۱۷ پوائنٹ کرنے والی ٹیم جیتے گی۔ یعنی 2 پوائنٹ کا فرق ہونا چاہیے۔ والی بال میں پوائنٹ ہمیشہ سروس کرنے والی ٹیم کو ہی ملتے ہیں۔ اگر سروس کرنے والی ٹیم پوائنٹ ہار جائے تو مخالف ٹیم کو سروس مِل جاتی ہے۔ اِس کھیل میں پانچ گیم ہوتے ہیں۔ جو ٹیم تین گیم جیت لے وہ جیت جاتی ہے۔

پاکستان میں بھی یہ کھیل بڑے شوق سے کھیلا جاتا ہے۔ ہمارے دیہاتوں قصبوں اور شہروں میں شام کو لوگ کسی کھُلی جگہ نیٹ لگا کر کھیلتے ہیں۔ پاکستان میں جنوری 1955 میں والی بال فیڈریشن قائم ہُوئی تھی۔ پاکستان کی ٹیمیں اکثر ایشیائی کھیلوں میں شرکت کر چکی ہیں۔ شروع میں تو اِس کھیل میں پاکستان نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا مگر بعد میں پاکستانی والی بال ٹیم کوئی خاص کارکردگی پیش نہ کر سکی۔ پاکستان نے اِس کھیل میں بھی نام پیدا کرنا ہے تو اِس کو اسکول، کالجوں کی سطح سے ہی منظم کیا جانا چاہیے تاکہ اچھے کھلاڑی دستیاب ہو سکیں اور ہمارے مُلک کا نام بھی والی بال کی اچھی ٹیموں میں شامل ہو۔

بھوتوں کی بارات

شاہ جہاں احمد رانا

وُہ سردیوں کی ایک کالی اور بھیانک رات تھی۔ میں ڈرائنگ رُوم میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا۔ کلاک نے جُوں ہی دس بجنے کا اعلان کیا، میں نے خبریں سُننے کے لیے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ لیکن جُوں ہی خبریں شروع ہوئیں، ایک دم بجلی چلی گئی۔

میں نے اُٹھ کر کھڑکی کا پردہ اُٹھایا اور باہر جھانکا۔ ساری کالونی اندھیرے کے گہرے سمندر میں ڈوبی ہُوئی تھی۔ ناچار بجلی کا سوئچ آف کیا، اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر باہر نکلا اور ڈرائنگ رُوم کا دروازہ لاک کر دیا۔ ہر سُو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اسی گھُپ اندھیرے میں اُس خوف ناک کہانی نے جنم لیا جو میں آپ کو سُنانے والا ہُوں۔

ڈرائنگ رُوم کے دائیں جانب میری چھوٹی بہن شہلا اور باجی شاہدہ کا کمرا تھا۔ شہلا بجلی کو کوس رہی تھی کیوں کہ صُبح اُس کا پہلا پرچہ تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ صُبح جلدی اُٹھ کر پڑھ لینا۔ مگر اُسے ضِد تھی کہ ابھی پڑھنا ہے۔ اُس نے موم بتّی جلا کر میز پر رکھ دی اور پڑھنے میں مشغُول ہو گئی۔ امّی جان کی طبیعت کُچھ خراب تھی۔ وُہ شام ہی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ اُنھوں نے آواز دے کر کہا ”سوئچ آف کر دو۔ بجلی آگئی تو رات بھر بتّیاں جلتی رہیں گی۔“ میں نے اُن کے حُکم کی تعمیل کی اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ چند لمحوں بعد میں نیند کی آغوش میں پہنچ چُکا تھا۔

مجھے سوئے ہُوئے ابھی ایک گھنٹا ہی ہُوا ہو گا کہ اچانک آنکھ کھُل گئی۔ کسی کی دہشت ناک چیخ سُنائی دی تھی — لیکن ذرا ٹھہریے۔ میری آپ بیتی سُننے سے پہلے، شہلا کی سرگزشت سُن لیجیے۔ شہلا نے مجھے بتایا کہ آپ کے جانے کے بعد ایک گھنٹے تک میں پڑھتی رہی۔ موم بتّی کی روشنی میں زیادہ دیر تک پڑھنا مشکل تھا۔ سوچا، صُبح اُٹھ کر پڑھ لُوں گی۔ یہ سوچ کر بستر پر لیٹ گئی اور جلد ہی سو گئی۔ لیکن مشکل سے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ کسی نے جھنجوڑ کر اُٹھا دیا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِردگرد کا جائزہ لیا۔ لیکن کوئی خاص بات معلُوم نہ ہو سکی۔ موم بتّی کی زرد زرد روشنی بڑی پُراسرار معلُوم ہو رہی تھی یکایک روشن دان میں سے سرد ہوا کا جھونکا آیا اور موم بتّی پھڑپھڑا کر بُجھ گئی۔ ہر طرف اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے آنکھیں مُوند لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی کہ اچانک ایسا محسُوس ہُوا جیسے کوئی نزدیک ہی ہولے ہولے گا رہا ہے۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور کان لگا کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی کہ یہ آواز کِس طرف سے آ رہی ہے۔ یہ معلُوم کر کے حیرت ہُوئی کہ آواز ڈرائنگ رُوم میں سے آ رہی تھی۔ یا اللہ ! یہ کون ہے جو اِس وقت ہمارے ڈرائنگ رُوم میں طبلہ سارنگی لیے بیٹھا ہے !

میں نے باجی شاہدہ کو، جو مزے سے لیٹی ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھیں، کہنی سے ٹھوکا دیا۔ وہ اِس اچانک حملے سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔ اُن

کے غصے سے میں واقف تھی۔ خاص کر اُس وقت جب اُنھیں کوئی سوتے میں اُٹھادے۔ میں سہم کر دبک گئی۔ وہ کمر سہلاتے ہُوئے بولیں "نامعقول کہیں کی۔ سوتے میں بھی ہاتھ پاؤں چلاتی رہتی ہے۔"

مجھے ہنسی تو بہُت آئی مگر یہ ہنسنے کا موقع نہ تھا۔ میں نے اُن کے کان میں کہا "ڈرائنگ رُوم میں کوئی گارہا ہے!" اور یہ کہہ کر اُن سے چپک گئی۔

باجی پہلے تو حیران ہُوئیں۔ پھر کان لگا کر سُننے لگیں۔ مگر وہ آواز غائب ہوچکی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ جھنجلا کر بولیں "دیکھ بے بی! سوجا، آرام سے۔ ورنہ ایک دھول تیری کھوپڑی پر ایسی لگاؤں گی کہ چودہ طبق روشن ہوجائیں گے۔ اور پھر جو تُونے رونا شروع کر دیا تو تیری باں باں کو بریک بھی نہیں لگیں گے۔ نالائق نے اِتنے زور سے کہنی میری کمر پر ماری ہے کہ ضرور کوئی ہڈی وڈی چٹخ گئی ہوگی۔"

میں نے باجی کو یقین دِلانے کی کوشش کی کہ ڈرائنگ رُوم میں میں نے کسی کو گاتے سُنا ہے، اور اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے دو چار قسمیں بھی کھالیں۔

"اچھا تو پھر آؤ" وہ میرا کان پکڑ کر اُٹھانے لگیں "چل کر مُجھے دکھاؤ۔ میں اُس کی ناک نہ توڑ دُوں تو میرا نام نہیں۔"

اُسی لمحے پھر آواز آنے لگی۔ وُہی دھیمی دھیمی پُراسرار قسم کی آواز۔ باجی نے سُنا تو ایک دم سہم کر بیٹھ گئیں۔ میں بھی اُن کی بغل میں گھُس گئی پھر وہ دھیمی دھیمی آواز اُونچی ہوتی گئی۔ اب ایک کے بجائے کئی آوازیں اُس کے ساتھ شامل ہوگئی تھیں۔ ہم نے جلدی سے اِس پاس سے لحاف کو اچھی طرح نیچے دبا لیا۔ "خدا کی پناہ! کتنی خوف ناک آواز ہے!" میں نے باجی سے کہا۔ باجی نے کہا "ایسا لگتا ہے جیسے بہُت سارے بھُوت مِل کر گارہے ہیں۔ شاید بھُوتوں کی کوئی بارات ہمارے گھر میں اُتر آئی ہے۔"

میں تھر تھر کانپنے لگی اور باجی نے آیتُ الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔ آوازیں برابر آرہی تھیں۔ میں نے سوچا، ایسا نہ ہو کہ بھُوت گاتے گاتے ایک دم حملہ کر دیں۔ میں نے باجی کو اِس خطرے سے آگاہ کرنا چاہا، مگر وہ فٹافٹ آیتُ الکرسی پڑھے جارہی تھیں۔ میرا دل ڈُوبنے لگا۔ بھُوتوں کے خوف ناک سائے آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگے۔ پھر اچانک اِس طرح کی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی ہنس رہا ہو یا شاید رو رہا ہو۔ یہ سُن کر ہم دونوں کی چیخیں نکل گئیں اور ہم تقریباً بے ہوش ہوگئے!

یہ تو تھی شملا کی سرگزشت۔ اب میری سُنیے۔

جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہُوں، مُجھے سوتے ہُوئے ایک گھنٹا ہُوا ہوگا کہ اچانک آنکھ کھُل گئی۔ آنکھ بِلا وجہ نہیں کھُلی تھی۔ میں کسی کی چیخ سے چونکا تھا۔ مگر کون چیخا تھا؟ یہ علم نہ ہوسکا۔ ہوسکتا ہے میرا وہم ہو۔ لیکن اُسی لمحے کچھ پُراسرار آوازیں سنائی دیں جن کے متعلق بعد میں معلوم ہُوا کہ شملا اور باجی شاہدہ یہی آوازیں سُن کر چیخی تھیں اور اُنھی کی چیخوں سے میری آنکھ کھُلی تھی۔ پھر مُجھے ایسا محسُوس ہُوا جیسے کوئی چل رہا ہے۔ قدموں کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی، اور یہ آواز ڈرائنگ رُوم میں سے آرہی تھی۔ میں نے الماری میں سے ٹارچ نکالی، کونے میں رکھی ہُوئی ہاکی اسٹک اُٹھائی، اور ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں کہ کھٹک کی آواز آئی اور باہر برآمدے میں روشنی ہوگئی۔ میں چیتے کی سی پھُرتی سے باہر نکلا۔ دیکھا تو امّی جان برآمدے میں کھڑی ڈرائنگ رُوم کی طرف گھُور رہی ہیں۔ میں نے جلدی سے ٹارچ جلائی اور کمرے کی طرف لپکا۔

اکثر سُننے میں آتا ہے کہ فلاں مکان میں بھُوت رہتے ہیں یا فلاں مکان آسیب زدہ ہے۔ مگر میں ایسی تمام باتوں کو جہالت سمجھتا تھا۔ لیکن یہ آوازیں تو بلاشبہ ڈرائنگ رُوم میں سے آرہی تھیں!

میں نے آگے بڑھ کر آہستہ سے تالا کھولا۔ میں چاہتا تھا کہ جو بھی کمرے میں ہے، اُسے اچانک جالوں — تالا کھولنے کے بعد پاؤں کے ایک جھٹکے سے دروازے کو دھکا دیا اور زور سے چیخا "کون ہے؟" گانے کی آواز فوراً بند ہوگئی اور اُس کی جگہ شٹر شٹر کی آواز آنے لگی۔ میری ٹارچ کی روشنی کا دائرہ کمرے میں گھوم رہا تھا۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پڑی تھی لیکن ایک چیز جسے دیکھ کر میں چونکا اور میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہاں کوئی موجود ہے، وہ تھا ہیٹر جو جل رہا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ لیکن کمرے میں کسی نیک یا بدرُوح کا وجُود نہ تھا۔ مگر شٹر شٹر کی آواز بدستور آ رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر بتی جلانے کے لیے جُوں ہی سوئچ بورڈ پر ہاتھ رکھا، قریب ہی ایک خوف ناک آواز اُبھری۔ میں ڈر کے اُچھلا تو میرا پاؤں کسی چیز میں اُلجھ گیا اور میں اوندھے مُنھ فرش پر گر پڑا۔ ہاکی اِسٹک اور ٹارچ ہاتھ سے چھُوٹ کر دُور جا گری۔ شاید میرا پاؤں ہیٹر کے تار میں اُلجھ گیا تھا۔ اِسی لیے وُہ بُجھ گیا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔

چاروں طرف گہرا سناٹا تھا کہ اِتنے میں نزدیک ہی کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ لیکن وہ چاپ امّی جان کے قدموں کی تھی۔ یہ اُس وقت معلوم ہُوا جب اُنھوں نے مُجھے آواز دی۔ میں جلدی سے اُٹھا، سوئچ بورڈ کی طرف گیا اور سوئچ آن کر دیا۔ سارا کمرا روشنی سے جگ مگانے لگا۔ امّی حیرت کی تصویر بنی مُجھے گھُور رہی تھیں۔ ہم نے ایک ایک چیز دیکھی، مگر اُس پُراسرار آواز کا سُراغ نہ مل سکا۔ یکایک مُجھے یاد آیا کہ آواز میرے گرنے کے بعد بند ہُوئی تھی۔ میں نے اُس جگہ کا اچھّی طرح مُعاینہ کیا اور پھر ——— سارا مسئلہ حل ہوگیا۔ میں نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔

امّی حیرت سے بولیں "کیا بات ہے؟"

"بھُوت پکڑے گئے!" میں نے جواب دیا۔

اُنھوں نے بہتیرا کہا کہ بتاؤ تو کیا بات ہے، مگر میں نے کہا "ٹھہر جائیے۔ ذرا اُن دونوں کو بھی بُلا لُوں!" میں نے شملا اور باجی شاہدہ کا دروازہ کھٹ کھٹایا تو اُنھوں نے خوف سے سانس روک لی۔ اِس پر میں نے اُنھیں بتایا کہ میں ہُوں، گھبراؤ نہیں۔ تب کہیں جا کر اُنھوں نے دروازہ کھولا اور میں نے بڑی مشکل سے اُنھیں ڈرائنگ رُوم میں چلنے پر راضی کیا۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے ریڈیو کا تار، جو میرے پاؤں میں اُلجھ کر نیچے گر گیا تھا، پلگ میں لگایا تو ریڈیو سے بھُوتوں کا نغمہ شروع ہو گیا۔ دونوں بہنیں پہلے تو چیخنے لگیں لیکن پھر فوراً ہی چیخنے کا اِرادہ مُلتوی کر دیا۔ دراصل بجلی جانے کے بعد میں نے بتّی کا سوئچ تو بند کر دیا تھا لیکن ہیٹر اور ریڈیو بند کرنا بھُول گیا تھا۔ آدھی رات کو بجلی آئی تو دُور دراز کے اسٹیشن (جو نزدیک نزدیک تھے) بولنے لگے۔ کبھی صِرف ایک آواز آتی اور کبھی دونوں۔ کبھی دونوں کی آواز بند ہو جاتی اور صِرف ریڈیو کی شٹر شٹر رہ جاتی۔ ریڈیو کا بلب فیوز ہو گیا تھا اِس لیے جب میں کمرے میں داخل ہُوا تو یہ معلُوم نہ ہو سکا کہ ریڈیو چل رہا ہے۔

شملا اور شاہدہ باجی نے پہلے تو ہونقوں کی طرح ایک دُوسرے کو دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ امّی مُسکراتی ہُوئی چلی گئیں۔ میں نے بھُوت صاحب کو، کان مروڑ کر، خاموش کر دیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میری ذرا سی غلطی سے اِتنی دِل چسپ کہانی بن گئی۔

اللہ کو یاد کرنا بہُت بڑی عبادت ہے۔ زمین کے جس حصّے پر اللہ کا ذکر کیا جائے وہ اپنے سے نیچے کی زمین پر فخر کرتا ہے۔ ایک پہاڑ دُوسرے پہاڑ کو آواز دے کر پُوچھتا ہے کہ کیا کوئی اللہ کا ذکر کرنے والا تجھ پر سے گزُرا ہے؟ اگر وہ کہے "ہاں"، تو وہ پہاڑ خوش ہو جاتا ہے۔

حضُور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ جو شخص خوشی کے وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے، اُس پر کوئی مُصیبت آ پڑے تو فرشتے اُس کی دُعا سُن کر کہتے ہیں کہ آواز تو جانی پہچانی ہے۔" پھر اُس کی تکلیف دُور کرانے کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گِڑگِڑاتے ہیں۔ اِس کے مُقابلے میں جو شخص صِرف دُکھ اور تکلیف میں اللہ کو یاد کرتا ہے تو فرشتے اُس کی آواز سُن کر کہتے ہیں "کوئی اجنبی معلُوم ہوتا ہے۔ ہم نے تو یہ آواز پہلے کبھی نہیں سُنی۔"

ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کی زبان اللہ کا ذِکر کرتی رہتی ہے، وُہ جنّت میں مُسکراتے ہُوئے جائیں گے۔

حضُور صلّی اللہ علیہ وسلّم ارشاد فرماتے ہیں "حضرت جبرائیلؑ مُجھے اللہ کے ذِکر کی اِس قدر تاکید فرماتے تھے کہ مُجھے یُوں محسُوس ہونے لگا جیسے ذکر کے بغیر کوئی چیز نفع نہیں دے گی۔"

بُڑھیا، خزانہ اور ڈاکو

ممتاز احمد تسنیم

"مِل گیا۔ مِل گیا۔ ارے بھئی! مِل گیا۔" گھر میں داخل ہوتے ہی سعید صاحب نے نعرہ لگایا۔

پمّی جلدی سے کمرے میں آئی اور بولی "کیا مِل گیا، ابوّجی؟"

سعید صاحب نے کہا "مُبارک ہو! مکان مِل گیا۔"

"مکان!" پمّی حیرانی سے بولی "کیسا ہے؟ کتنا بڑا ہے؟ کتنے کمرے ہیں؟ کس جگہ ہے؟"

"ارے رر رر! تم نے تو ایک دم اِتنے سارے سوالات کر ڈالے۔ جاؤ۔ اپنی امّی کو بتاؤ۔ آج کل مکان مِلنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں اور پھر کرایہ بھی تین ہزار رُوپے۔"

پمّی کی امّی اُس وقت چائے بنا رہی تھیں۔ اُنھوں نے یہ خوش خبری سُنی تو سب کام چھوڑ چھاڑ بھاگی آئیں اور بولیں "یہ تو بُہت اچھا ہُوا۔ کب چل رہے ہیں دیکھنے؟"

سعید صاحب نے کہا "بس جلدی سے چائے تیار کرلو۔ پی کر چلیں گے۔"

سعید صاحب کراچی میں انجنیئر تھے۔ اچانک ہی اُنھیں لاہور تبدیل کر دیا گیا۔ تبدیلی چُوں کہ مُستقل تھی اِس لیے وہ اپنا تمام سامان بھی یہاں لے آئے تھے۔ اُنھوں نے یہاں کرائے کا مکان حاصل کرنے کی بُہت کوشش کی لیکن بے سُود۔ آخر اُنھیں ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ پمّی آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُس کو یہاں گرمیوں کی چُھٹیوں کی وجہ سے ابھی داخلہ نہ مِل سکا تھا۔ اُس کے ابوّجی کہتے تھے کہ سکول کُھل جائیں تو وُہ اُسے داخل کرا دیں گے۔

چائے پی کر اُنھوں نے ٹیکسی منگوائی اور تینوں مکان دیکھنے چل دیے۔ مکان شہر سے باہر سڑک سے سو گز کے فاصلے پر تھا۔ پمّی کے ابّا نے دروازے کے سامنے ٹیکسی رُکوائی۔ سب اُتر پڑے۔ پمّی حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مکان کے سامنے باغ تھا جس میں مہندی کی باڑ سُوکھ کر ٹہنیوں کی صُورت میں رہ گئی تھی۔ گھاس بھی خُشک اور لمبی لمبی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عرصے سے کسی نے اِس کی رکھوالی نہیں کی۔

مکان کی چابی سعید صاحب مالکِ مکان سے لے آئے تھے۔ تمام کمروں کے فرش دُھول سے اَٹے ہُوئے تھے۔ دیواروں اور دروازوں پر مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے اور اندر موٹے موٹے چُوہے ایک دُوسرے سے لڑ رہے تھے۔ آدمیوں کو آتے دیکھ کر وُہ فوراً بھاگ گئے۔ پمّی بولی "ابوّجی! یہ بڑی ویران جگہ ہے۔ آس پاس کوئی مکان بھی نہیں۔"

سعید صاحب نے کہا "گھبراؤ مت، قریب ہی دو چار کوٹھیاں ہیں۔ وہ دیکھو۔" اُنھوں نے کھڑکی کھول کر ایک کوٹھی کی طرف اشارہ کیا جو وہاں سے سو گز دُور تھی۔ اِسی طرح کُچھ فاصلے پر اور کوٹھیاں بھی تھیں۔

پمّی بولی "لیکن ابوّجی میں سکول کیسے جایا کروں گی؟"

سعید صاحب ہنس پڑے "ارے بھئی، اتنی جلدی تمھیں اپنی فکر پڑ گئی۔ سکول کُھلنے میں ابھی دو مہینے ہیں۔ جب تم داخل ہو جاؤ گی تو صُبح کو میں تمھیں موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے جایا کروں گا اور واپسی پر تم بس سے آ جایا کرنا۔"

امّی بولیں "آؤ، اب چلیں۔ کل جُمعہ ہے۔ کل آ کر ہم اِس کی صفائی کریں گے۔"

دُوسرے دِن سب نے مِل کر مکان کی صفائی کی اور سامان مُناسب جگہوں پر رکھ دیا۔ مکان کے سامنے ایک باغ تھا اور اِردگِرد بہت سے کھیت اور درخت۔ پمّی سارا دِن امّی کے ساتھ کام کیا کرتی۔ جب تھک جاتی تو باہر سیر کرنے نکل جاتی۔ دوپہر کو امّی سے پڑھتی اور جب تین چار بجے اُس کے ابّا جی آتے تو اُن کے ساتھ چائے پی کر باہر سیر کے لیے چلی جاتی۔ اُس نے اپنی سہیلیوں کو خطوط لکھے کہ اُنھیں کوٹھی نُما مکان مِل گیا ہے۔

پندرہ دِن بعد ڈاکیا بہت سے خطوط لے کر آیا۔ اُس نے پُوچھا "بیٹی، تم یہاں کب سے رہتی ہو؟"

"جی ہمیں ابھی پندرہ دِن ہی ہُوئے ہیں یہاں آئے۔"

"تم نے اِس مکان میں کبھی کسی کا بُھوت تو نہیں دیکھا؟" ڈاکیے نے پُوچھا۔

"بُھوت!" پمّی ڈر کر بولی "کِس کا بُھوت؟ کیسا بُھوت؟"

"ارے! تو تمھیں اِس مکان کے مُتعلّق کُچھ معلوم نہیں؟ چند ماہ پہلے یہاں ایک مال دار بُڑھیا رہتی تھی جو بڑی کنجوس تھی۔ اُس نے اپنا رُوپیہ اِس مکان میں کِسی جگہ دبا رکھا تھا۔ ایک دِن کسی ڈاکُو کو معلوم ہو گیا کہ بُڑھیا کے پاس بہت سا روپیہ ہے۔ وہ بُڑھیا کو زبردستی اُٹھا کر کہیں لے گیا۔ یہ پتا نہیں کہ اس پر کیا بیتی۔ لیکن لوگوں کو اِس بات کا پُورا یقین ہے کہ بُڑھیا کا روپیہ اِس ڈاکو کو نہیں مِلا کیوں کہ کئی لوگوں نے رات کے وقت اُسے یہاں آتے دیکھا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ روپیہ ابھی تک مکان میں موجود ہے اور وہ بدمعاش اِسی کی تلاش میں یہاں آتا ہے۔"

ڈاکیا تو چلا گیا اور پمّی کے دماغ میں بُڑھیا، خزانہ اور ڈاکُو چکّر لگانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ خطوط لے کر اندر گئی اور اپنی امّی کو تمام بات

بتائی۔ امّی ہنس پڑیں "اری پگلی! اگر یہاں کوئی خزانہ دفن ہوتا تو تلاش کرنے والا فرش اور الماریوں کو اکھاڑ کر رکھ دیتا۔ لوگ یُوں ہی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔"

دوپہر کو جب ابوّجی آئے تو پمّی بولی "ابُّو، آپ نے اِس مکان کے مُتعلّق بُڑھیا والی کہانی سُنی ہے؟"

وُہ بولے "ہاں۔ سُنی تو ہے، لیکن وُہ سچّی معلوم نہیں ہوتی۔ تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کل ہی ایک کُتّا لے آؤں گا۔ تمھارا دل بھی بہلا رہے گا اور مکان کی حفاظت بھی ہو جایا کرے گی۔"

اگلے دِن اُس کے ابوّجی ایک کُتّا لے آئے۔ سفید اور سیاہ بالوں والا پیارا سا کُتّا۔ پمّی نے اُس کا نام ڈیگی رکھا۔ ایک دِن دوپہر کے وقت جب امّی سو رہی تھیں اور پمّی اپنے کمرے میں کتاب پڑھ رہی تھی کہ اچانک اُس کو کھڑکی میں کسی آدمی کا چہرہ نظر آیا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں، رنگ سیاہ اور سر پر پگڑی بندھی ہُوئی تھی۔ پمّی نے اُسے دیکھ کر ڈیگی کو آواز دی اور چور چور کا شور مچا دیا۔ ڈیگی اُس کی آواز سُن کر بھاگا آیا۔ پمّی نے کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا "ڈیگی! باہر چور ہے۔ پکڑو۔" ڈیگی بھونکتا ہُوا چھلانگ لگا کر باہر کُود گیا۔ اِتنے میں پمّی کی امّی بھی گھبرائی ہُوئی آ گئیں "کیا ہُوا، بیٹی؟ تم کیوں چیخ رہی ہو؟"

پمّی ہانپتی ہُوئی بولی "امّی، میں نے ابھی ابھی کھڑکی میں ایک چور دیکھا ہے۔ ڈیگی اُسے پکڑنے گیا ہے۔"

امّی نے کھڑکی کے باہر دیکھ کر کہا "پگلی! یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ ڈیگی باہر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔"

پمّی روہانسی ہو کر بولی "نہیں امّی۔ میں نے سچ مُچ چور کو دیکھا تھا۔"

"تمھیں تو وہم ہو گیا ہے۔ چلو اپنا کام کرو۔" یہ کہ کر وہ دُوسرے کمرے میں چلی گئیں اور پمّی کتاب پڑھنے لگی۔ شام کو پمّی کے ابو آئے تو اُس نے اِس واقعہ کا ذکر کیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے "چُوں کہ تم ڈاکیے کی بتائی ہُوئی کہانی کے مُتعلّق بہت زیادہ سوچتی رہی ہو، اِس لیے تمھیں وُہی شکل نظر آئی جو تمھارے دماغ میں سمائی ہُوئی ہے۔ اِس کی حقیقت کُچھ بھی نہیں۔" پمّی چُپ ہو رہی۔

ایک دِن دوپہر کا کھانا کھا کر امّی بولیں "پمّی، تم گھر میں ٹھہرو۔ میں ذرا پاس والے بنگلے تک ہو آؤں۔ کئی دِن سے وہ لوگ مجھے بُلا رہے ہیں مگر فُرصت ہی نہیں مِلتی۔ بس ابھی آئی۔ ڈرنا نہیں۔"

امّی کے جانے کے بعد پمّی الماری میں کتابوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے لگی۔ اُس نے الماری کے خانے میں سے کتاب اُٹھائی تو اچانک اُس کا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا اور ایسی آواز پیدا ہُوئی جیسے وہاں اینٹ کی جگہ لکڑی لگی ہے۔ پمّی کو بڑی حیرت ہُوئی۔ اُس نے پرکار اُٹھائی اور اِس جگہ کو کُریدنا شروع کیا۔ تھوڑی سی مٹّی کرنے کے بعد لکڑی صاف دِکھائی دینے لگی۔ اُس نے دراڑ میں ہاتھ ڈال کر لکڑی کو باہر کھینچا اور اندر ہاتھ ڈالا تو اُس کی انگلیاں کسی کاغذ سے ٹکرائیں۔ یہ ایک زرد رنگ کا پھُولا ہُوا لفافہ تھا جس پر مٹّی کی ہلکی سی تہ جمی ہُوئی تھی۔ پمّی کا دِل زور سے دھڑکا۔

"ارے تو خزانے والی بات سچ ہے، اِس لفافے میں یقیناً بہُت سے نوٹ ہوں گے۔"

وہ لفافے کو کھولنا ہی چاہتی تھی کہ کھڑکی میں سے کسی کی بھاری آواز آئی "تم سے نہیں کھُلے گا۔ لاؤ، میں کھول دُوں۔"

پمّی نے مُڑ کر دیکھا تو اُسے وُہی ڈاکو نظر آیا جسے وہ پہلے دیکھ چکی تھی۔ وہ کھڑکی میں سے کُود کر اندر آ گیا۔ پمّی نے لفافہ دونوں ہاتھوں میں لے کر پیچھے چھُپا لیا۔ ڈاکو آگے بڑھتا ہُوا بولا "شاباش! یہ لفافہ مجھے دے دو۔ میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ لاؤ۔ جلدی کرو۔"

پمّی جلدی سے کمرے میں پڑی ہُوئی گول میز کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور بولی "نہیں نہیں۔ میں تمھیں یہ لفافہ نہیں دُوں گی۔ تم ڈاکو ہو۔ تم نے بڑھیا کا خُون کیا ہے۔ چلے جاؤ، یہاں سے۔"

ڈاکو نے جیب سے چاقو نکال لیا اور بولا "سیدھی طرح مان جا۔ ورنہ یاد رکھ، جو شخص ایک کا خُون کر سکتا ہے، وہ دُوسرے کی گردن بھی مروڑ سکتا ہے۔ چل، جلدی کر۔ لفافہ مجھے دے دے۔"

"ہرگز نہیں،" پمّی نے بڑے حوصلے سے کہا۔

یہ سُن کر ڈاکو دانت پیستا ہُوا پمّی کی طرف لپکا اور دونوں میز کے گرد آگے پیچھے بھاگنے لگے۔ پمّی چیخ رہی تھی "میں لفافہ نہیں دُوں گی ڈیگی! ڈیگی! آؤ اِس ڈاکو کو پکڑو۔"

اچانک دروازے میں ڈیگی نمودار ہُوا۔ اُس نے ایک غیر آدمی کو پمّی کے پیچھے بھاگتے دیکھا تو جھٹ اُس پر چھلانگ لگا دی اور اُس کی کلائی بھنبھوڑنے لگا۔ ڈاکو اِس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا اور اُس کے ہاتھ سے چاقو چھُوٹ کر دُور جا پڑا۔ پمّی نے

جلدی سے چاقو اُٹھا کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔

ڈاکو نے ڈیگی کے مُنھ سے اپنی کلائی چھُڑائی اور اُسے پرے دھکیل دیا مگر ڈیگی نے دوبارہ حملہ کر کے اُس کی دُوسری کلائی کو مُنھ میں دبا لیا۔ اِتنے میں پمّی نے کار کی آواز سُنی۔ وہ فوراً باہر بھاگی اور چیخ کر بولی "ابّو! اندر ایک ڈاکو ہے۔ جلدی آئیے۔"

ابّو بھاگتے ہُوئے آئے۔ اندر ڈیگی اور ڈاکو کی کشتی ہو رہی تھی۔ اُنھوں نے آتے ہی ایسا تان کر مُکّا مارا کہ ڈاکو بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اِتنے میں پمّی کی امّی بھی آ گئیں۔ وُہ یہ منظر دیکھ کر بہُت خوف زدہ ہُوئیں۔ ابّو نے ڈاکو کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور خود پولیس کو بُلانے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک پولیس انسپکٹر اور تین سپاہیوں کو لے کر آ گئے۔ سپاہیوں نے ڈاکو کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگائی اور اُسے تھانے لے گئے۔ ابّو کو بھی اُن کے ساتھ جانا پڑا۔

پمّی کے ابّو واپس آئے تو اُنھوں نے کہا "پمّی، بیٹے! تم نے وُہ کام کیا ہے جو بہادر سے بہادر مرد بھی نہیں کر سکتا۔ وہ بُڑھیا زندہ ہے۔ اُس ڈاکو نے اُسے اپنے گھر میں بند کر رکھا تھا، اور روز مار کر تا تھا کہ وُہ اُسے وُہ جگہ بتا دے جہاں اُس نے رُوپیہ چھُپایا ہے۔ لیکن اُس بے چاری کے پاس رُوپے ہوتے تو بتاتی۔ لوگوں نے یُوں ہی اُڑا دی تھی کہ وہ بہُت مال دار ہے اور اُس نے اپنی دولت کہیں چھُپا رکھی ہے۔"

پمّی نے پُوچھا "لیکن ابّو، وہ لفافہ؟"

ابّو بولے "ارے بھئی، اُس میں روپے کہاں تھے۔ وہ تو بُڑھیا کے چند خطوط اور اُس کے رشتے داروں کی تصویریں تھیں۔"

پمّی پہلے تو حیران ہُوئی اور پھر کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ ڈیگی بھی بھوں بھوں کر کے اُس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

دماغ لڑاؤ

داؤدی علمی معمّا

ماہ دسمبر کا بنیادی لفظ "مقصودِ حیات"

ھدایات

1. نو حرفی بنیادی لفظ کا بتانا ضروری ہے۔ غلط بنیادی لفظ والے حل مقابلے میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ بنیادی لفظ شروع میں لکھا جائے۔
2. مرکز میں جو سفید حرف دیا گیا ہے، بدلتے ہوئے الفاظ میں اس حرف کا آنا لازمی ہے۔ (آگے پیچھے اور درمیان میں، کہیں بھی)
3. الفاظ بامعنی ہونے چاہئیں۔
4. حل بھیجنے کی آخری تاریخ 10 جنوری 1989 ہے۔
5. اگر بنیادی لفظ کے حروف میں سب حروف الگ الگ ہوں تو تشدید شدہ والا لفظ غلط ہوگا۔ اگر ان میں ایک ہی قسم کے دو حروف آجائیں تو صرف اُن کو مشدّد لکھا جا سکتا ہے۔
6. حل کرنے والے دوستوں کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ انعام مرسلہ حل کی تعداد پر نہیں بلکہ صحیح الفاظ کی کثرت پر دیا جاتا ہے۔
7. بے معنی الفاظ لکھنا اپنا اور ہمارا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس سے پرہیز کریں۔
8. کسی لفظ کو دوبار لکھنا دھوکا ہے اس سے دونوں لفظ غلط ہو سکتے ہیں۔ اس سے بچا جائے۔
9. حل شدہ الفاظ کی تعداد ابتدا میں تحریر کی جائے یا ان کا نمبر شمار لکھا جائے۔
10. بغیر کوپن کے حل مقابلے میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ کوپن کو حل کی ابتدا میں اچھی طرح چسپاں کریں۔ چسپاں نہ کیے ہوئے کوپن اکثر ضائع ہو جاتے ہیں جس سے حل کرنے والے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

مندرجہ ذیل بچے اپنی محنت کی بنا پر انعام کے حق دار قرار پائے۔ — تعداد الفاظ

نام و پتا	تعداد الفاظ
پہلا انعام: شاہد محمود، مکان نمبر 673/ح سیٹلائٹ ٹاؤن بہاول پور۔	428
دوسرا انعام: محمد ارشد ولد اسرخان موضع و ڈاک خانہ بڈہ، تحصیل و ضلع پشاور	320
تیسرا انعام: نوشین مسعود علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔	290

25-25 روپے کی کتب حاصل کرنے والے کامیاب بچے۔

نام و پتا	تعداد الفاظ
1۔ محمد سلام مکان نمبر 650/320 وارڈ نمبر 17، گلی گھیکاں والی، پرانا حاصل پور، ضلع بہاولپور	285
2۔ محمد احسن فاروق R-164 ماڈل ٹاؤن توسیعی سکیم لاہور۔	270
3۔ بازغا شاہ مکان نمبر 333/F رحمان پورہ کوارٹرز لاہور۔ 16	269
4۔ عفت جاوید ہاشمی 84۔ گل زیب کالونی سمن آباد لاہور۔	257
5۔ افتخار بٹی گلی نمبر 73، مکان نمبر 680/36 بزاز محلہ لاہور کینٹ۔	242
6۔ ثاقب تسین زیدی مکان نمبر 680/42 گلی نمبر 73 بزاز محلہ صدر بازار لاہور کینٹ۔	235
7۔ ثروت قیام G/291-14 واہ کینٹ۔	232
8۔ فیصل عزیز قصر گل، مرزا روڈ، اٹک۔	224
9۔ رانا عبدالمجید P-106، سٹاف کالونی، انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور	215
10۔ محمد منیب احمد صدیقی 672/ح سیٹلائٹ ٹاؤن بہاول پور۔	209
11۔ سید فرید احتشام خالد 95/A محل گشت ملتان۔	206
12۔ محمد عمار احسان A-453/D نارتھ ناظم آباد کراچی	201
13۔ محمد یسین قمر کلاس ہشتم A رول نمبر 11 گورنمنٹ سیٹلائٹ ٹاؤن ہائی سکول بہاولپور	200
14۔ نجلا ناظر، چوک صفاں والا، لاہور۔	198
15۔ مسر گل بی بی، ریلوے کالونی ملتان۔	197
16۔ رانا نعمان جاوید مکان نمبر F 69 گلی نمبر 25، وارڈ نمبر گکھڑ منڈی ضلع گوجرانوالہ۔	196
17۔ یاسر تنین B-K-25 سیٹلائٹ ٹاؤن بہاول پور۔	196
18۔ خالد جمیل 41/F سیٹلائٹ ٹاؤن جھنگ۔	193
19۔ خدیجہ بدر، گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ۔	192
20۔ محمد عرفان مجید معرفت عبدالمجید مہر 16۔ نسیمن کالونی رحیم یار خان۔	183
21۔ وسیم اختر معرفت ڈاکٹر محمد احمد ایس ایس او نیغاتر باب پشاور۔	183
22۔ صدف حمید گکھڑ منڈی ضلع گوجرانوالہ۔	179
23۔ نوید جمیل 18، نوشیرس اسلم روڈ نزد عید گاہ لائن کراچی ساؤتھ۔	178
24۔ ایاز قیصر 360۔ کیو (Q) ماڈل ٹاؤن لاہور۔	176
25۔ ریاض حسین بخاری معرفت اقبال حسین بوائلر سپر وائزر یونائیٹڈ شوگر مل بخش آباد، صادق آباد۔ ضلع رحیم یار خان۔	175
26۔ اُم کلثوم مخدوم۔ گجرات۔	175
27۔ آصف جاوید 7F/186 انوار چوک واہ کینٹ۔	172
28۔ حمیرہ واحد، کشمیر روڈ راولپنڈی۔	171
29۔ محمد یاسر اشرف معرفت محمد اشرف مکان نمبر 1725/195 گلی نمبر طارق آباد ملتان۔	170
30۔ عمران اسلم خان نیازی 8۔ واپڈا فلیٹس جیل روڈ شادمان لاہور	169
31۔ عامر غفور احمد 724۔ کیو بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور۔	168

آپ بھی لکھیے

دسمبر 1988 کے مقابلے میں
انعام پانے والی کہانیاں

نرالا تحفہ

الطاف حسین، گرو مندر، کراچی

"ساجد تم جب سے اسکول سے آئے ہو، کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے ہو۔ اِس پریشانی کی کوئی وجہ ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ۔ ممکن ہے میرے پاس اِس کو دُور کرنے کا کوئی حل ہو" ساجد کی امّی نے اُس کا پریشان چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

"امّی، میرے دوست شبّیر کی پرسوں سال گرہ ہے۔ اُس نے مجھے بار بار تاکید کی ہے کہ میں ضرور آؤں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ سال گرہ میں خالی ہاتھ نہیں جایا جاتا۔ میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔ لیکن اِن سے کوئی تحفہ نہیں خریدا جا سکتا۔ اِس بات نے مجھے پریشان کر دیا ہے" ساجد نے آخر پریشانی کی وجہ بتا دی۔

"کاش! آج تُمھارے ابّا زندہ ہوتے تو تمھیں تحفے کے لیے اتنا پریشان نہ ہونا پڑتا۔ جب سے وہ اللہ کو پیارے ہوئے ہیں، ہمارا ہر دن پریشانی کا دن اور ہر لمحہ دُکھ کا لمحہ بن گیا ہے" یہ کہتے ہُوئے ساجد کی امّی کی آنکھوں سے وہ آنسو چھلک ہی پڑے جنھیں وہ کافی دیر سے چھُپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"امّی آپ رو رہی ہیں؟ خدا کے لیے آپ میرے سامنے آنسو نہ بہایا کریں۔ میں آپ کو روتا دیکھتا ہُوں تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے" ساجد نے اپنی ماں کے بہتے ہُوئے آنسو پونچھتے ہُوئے کہا۔

"بیٹے، یہ تو اب میرا مُقدّر بن چکے ہیں۔ تمھارا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ جا کر اسکول کا کام کرو۔ میں سوچتی ہُوں، شاید تمھارے تحفے کا کوئی بندوبست ہو جائے۔"

ساجد ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح دُوسرے کمرے میں چلا گیا اور ہوم ورک کرنے لگا۔ ہوم ورک کے دوران بھی وہ تحفے کے مُتعلّق سوچتا رہا۔ پھر ایک دم اُس کا چہرہ خوشی سے کھِل اُٹھا۔ اُس کے دماغ میں ایک لاجواب خیال آیا تھا۔ وہ دوڑا دوڑا امّی کے پاس گیا اور بولا "امّی، میں نے شبّیر کو سال گرہ پر دینے کے لیے تحفے کا انتخاب کر لیا ہے۔"

"مجھے نہیں بتاؤ گے؟" امّی نے پوچھا۔

"معاف کیجیے۔ یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ البتّہ جس دن میں سال گرہ میں جاؤں گا، وہ تحفہ آپ کو ضرور دکھاؤں گا۔ جب تک انتظار کیجیے" ساجد سرگوشی کے انداز میں بولا۔

آج شبّیر کی سال گرہ تھی۔ پُورا گھر رنگ برنگ غُباروں اور جھنڈیوں سے سجا ہُوا تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی میز رکھی تھی جس پر کیک اور مہمانوں کے تحائف رکھے تھے۔ شبّیر کے کُچھ کلاس فیلو عمران، فیصل، حمید اور طاہر وغیرہ بھی موجود تھے۔ شبّیر بار بار گھر کے بڑے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسے کسی کا اِنتظار تھا۔ اُس کی یہ بے چینی اُس کے دوستوں نے بھانپ لی۔ حمید کہنے لگا:

"کیا بات ہے، شبّیر؟ یہ تُم بار بار دروازے کی طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"میں حیران ہُوں کہ اب تک ساجد کیوں نہیں آیا۔ اُس نے ساڑھے آٹھ بجے آنے کا کہا تھا اور اب پونے نو بجنے کو ہیں" شبّیر نے کہا۔

"ارے! وہ یتیم لڑکا! بھلا وہ تمھاری سالگرہ میں کیسے آسکتا ہے" فیصل بولا، جو ہمیشہ ساجد کی غُربت کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔

"کیوں؟ ساجد انسان نہیں جو میری سال گرہ میں نہیں آسکتا؟ وہ آئے گا اور تم دیکھو گے" شبّیر کو غصّہ آگیا، لیکن اُس نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہُوئے اپنے اُوپر قابُو پا لیا۔

"دراصل، دراصل، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ساجد غریب ہے۔ اتنے پیسے کہاں ہوں گے اُس کے پاس جو وہ سال گرہ میں آسکے۔ سال گرہ میں خالی ہاتھ تو نہیں آیا جاتا نا" فیصل دھیمی آواز میں بولا۔

"اگر وہ تحفہ نہ بھی لائے تو میں اُس کا اِستقبال اِسی طرح کروں گا، جس طرح دُوسروں کا کیا ہے۔ مجھے دوست چاہیے، تحفے نہیں۔ دوستی کو تحفوں سے نہیں پرکھا جاتا" شبّیر نے فیصل کو گھُورتے ہُوئے کہا۔

"بس بس! اب زیادہ بحث کر کے محفل کا مزہ خراب نہ کرو" طاہر نے بحث ختم کرنے کی کوشش کی۔

"دراصل فیصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ ساجد ...." حمید ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ شبّیر کی چہکتی آواز نے سب کو دروازے کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا "وہ دیکھو! ساجد آرہا ہے!"

ساجد ہاتھ میں ایک خوب صورت اور رنگین کاغذ میں لپٹا ہُوا پیکٹ تھامے اندر داخل ہُوا اور "السّلام علیکم" کہہ کر پیکٹ شبّیر کو دے دیا۔ "بہت بہت مُبارک!" اُس نے شبّیر سے ہاتھ مِلاتے ہُوئے کہا۔

اب تمام مہمان آگئے تھے۔ شبّیر نے ہاتھ میں چھُری تھامی اور موم بتّیاں بُجھا کر جیسے ہی کیک کاٹنا شروع کیا، کمرا "سال گرہ مُبارک" کی آوازوں سے گُونج اُٹھا۔

تقریب کے خاتمے پر مہمان آہستہ آہستہ رُخصت ہونے لگے جب

شبیر کے امّی ابّو آخری مہمان کو رخصت کرنے گیٹ تک گئے تو شبیر نے مہمانوں کے لائے ہوئے پیکٹوں کو کھولنا شروع کیا۔ کسی پیکٹ میں سے سوٹ کا کپڑا، کسی میں سے ڈاک ٹکٹ، کسی میں سے البم اور کسی میں سے کہانیوں کی کتابوں کا سیٹ نکلا۔ آخر میں شبیر نے ساجد کا پیکٹ کھولا۔ اُس کے اندر پھول دار کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی کتاب تھی اور اس پر تہ کیا ہُوا ایک کاغذ رکھا تھا۔ شبیر کاغذ کھول کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا :

پیارے دوست شبیر! السّلامُ علیکم

یہ تحفہ جو آج میں تمھیں دے رہا ہُوں، میرے والد صاحب انتقال سے ایک ماہ پہلے لائے تھے۔ جس دن تم نے مجھے سال گرہ میں آنے کا کہا تھا، اُس دن مجھے اسی تحفہ کا خیال آیا تھا، مجھے اُمّید ہے تم اِسے پسند کرو گے۔ دُعاؤں کے ساتھ۔ تمھارا دوست ساجد

شبیر نے خط پڑھ کر کتاب کے اُوپر سے کاغذ اُتارا تو اندر سُنہری جلد کا قرآن جھلملا رہا تھا۔ اُس نے قرآن شریف کو چوما اور فخریہ لہجے میں اُس کے مُنھ سے نکلا : "ساجد! تم بھی عظیم اور تمھارا تحفہ بھی عظیم!"

(پہلا اِنعام : 100 روپے کی کتابیں)

2

غلام حُسین میمن۔ کھائی روڈ، حیدر آباد

اُس وقت رات کے 11 بجے تھے اور آصف پڑھنے میں مصروف تھا۔ آج اُس نے اپنے محلّے میں جلوس کے ساتھ شریک ہو کر "پاکستان زندہ باد" اور "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے لگائے تھے اور ریڈیو پر قائدِ اعظم کی تقریر بھی سُنی تھی۔ اسی لیے وہ آج شام کو نہ پڑھ سکا تھا اور رات کے 12 بجے تک پڑھنا چاہتا تھا۔

اُس کے دسویں کے اِمتحان قریب تھے اور وہ دن رات دِل لگا کر پڑھ رہا تھا کیوں کہ اُس کے والد نے اُسے تاکید کرتے ہُوئے کہا تھا کہ بیٹا، مُسلمانوں کے وطن پاکستان میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی اشد ضرورت ہو گی، اور اُنھوں نے اُسے اِمتحان میں پاس ہونے پر ایک خوب صورت اور قیمتی تحفہ دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ یہ اُن دِنوں کا واقعہ ہے جب تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی اور مُسلمان ایک الگ وطن کے حصُول کے لیے دن رات جدّوجہد کر رہے تھے۔

دسویں کے اِمتحانات شروع ہُوئے اور آصف تمام پرچوں کو حل کرتا رہا۔ اور جب نتیجہ آیا تو اُس نے پُورے اسکول میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ بھاگ کر گھر آیا اور امّی کو یہ خوش خبری سُناتے ہُوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ امّی نے اُس کے ماتھے کو بوسہ دیا اور اُسے مبارک باد دی۔ تمام رات وہ اپنے ابّو کا انتظار کرتا رہا۔ اُس کی امّی نے بتایا تھا کہ آج کوئی اہم جلسہ ہے جو رات گئے تک جاری رہے گا اور تمھارے ابّو دیر سے آئیں گے۔ آصف کے دماغ میں وہ حسین اور قیمتی تحفہ گھوم رہا تھا جو اُس کے والد اُسے دینے والے تھے۔ اِنھی خیالات کے تانے بانے بُنتے بُنتے وہ نیند کی وادی میں چلا گیا۔

صبح اُٹھ کر سب سے پہلے اُس نے ابّو کو یہ خوش خبری سُنائی اور پھر اُمّید بھری نظروں سے اُنھیں دیکھنے لگا۔ ابّو نے اُس کا ماتھا چومتے ہُوئے اُسے مبارک باد دی اور کہا :

"بیٹے! میں نے تم سے کہا تھا نا، کہ میں تمھیں ایک قیمتی اور نرالا تحفہ دُوں گا۔ تو وہ قیمتی اور نرالا تحفہ پاکستان ہے۔ آزادی کا اِعلان ہو گیا ہے اور ہم عنقریب اپنا پیارا وطن پاکستان حاصل کر لیں گے۔"

آصف خیال ہی خیال میں اپنے آپ کو پاکستان کی سرزمین پر محسوس کرتے ہُوئے عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

(دُوسرا انعام : 50 رُوپے کی کتابیں)

3

چودھری محمد شہباز ناز۔ گوجرانوالہ

"اگلے اتوار کو میری سال گرہ ہے۔ رضیہ، تم ضرور آنا۔ میری بہُت سی سہیلیاں آ رہی ہیں" فرحانہ نے رضیہ سے کہا۔

رضیہ غمگین آواز میں بولی "میرے پاس نہ تو کوئی اچھی سی فراک ہے اور نہ تمھیں تحفہ دینے کے لیے پیسے۔"

فرحانہ بولی "میں تمھیں اپنی ایک فراک دے دُوں گی اور تحفے کی مجھے کوئی ضرُورت نہیں۔ بس تم آنا۔ دیکھنا کتنا مزہ آئے گا۔ میری باجی باجا بجائیں گی اور گیت بھی گائیں گی۔ اگر تم نہیں آئیں تو میں تم سے رُوٹھ جاؤں گی۔"

اِتنا کہ کر فرحانہ تو اپنی دُوسری سہیلیوں کو سال گرہ کی دعوت دینے بھاگ گئی اور رضیہ اپنی امّی کے پاس پہنچی۔

رضیہ کی امّی مشین پر جھکی کپڑے سی رہی تھیں۔ تین سال پہلے جب

رضیہ کے ابّو موٹر سائیکل کے حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے تب ہی سے اُس کی امی سلائی کا کام کر کے رضیہ کی پرورش کر رہی تھیں۔ اب رضیہ آٹھ سال کی تھی اور تیسری کلاس میں فرحانہ کے ساتھ پڑھتی تھی۔ فرحانہ امیر والدین کی ایک نیک اور رحم دل لڑکی تھی اور رضیہ پر جان چھڑکتی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ رضیہ کو بتا رہی تھی کہ اُس کی سال گرہ کے لیے کیا کیا تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اُس کی باجی نے اُس کے لیے سُرخ اُون کا سفید چمکدار موتیوں والا سویٹر بُنا ہے اور امی نے ریشمی کپڑے سلوائے ہیں۔ رضیہ کو موتیوں والا سُرخ سویٹر بہت پسند تھا۔ کئی دفعہ اُس نے امی سے کہا مگر امی ٹھنڈی سانس بھر کے خاموش ہو گئیں۔

اِدھر کچھ دِنوں سے امی کو بُخار رہنے لگا تھا اور کھانسی بھی بہت ہوتی تھی۔ اِس وجہ سے وہ سِلائی کا کام بھی کم کر پاتی تھیں۔ آج جب رضیہ نے اُن سے فرحانہ کی سال گرہ اور اپنے کپڑوں وغیرہ کا ذکر کیا تو انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اُسے اچھی سی فراک سی دیں گی اور فرحانہ کو دینے کے لیے تحفہ بھی لا دیں گی۔ رضیہ خوش ہو کر اُن کے گلے میں جھُولنے لگی۔ اچانک اُسے خیال آیا اور وہ پُوچھ بیٹھی "امی، میری سال گرہ کب ہوتی ہے؟ فرحانہ کی تو پچھلے سال بھی ہوئی تھی۔"

امی بولیں "تمھارے ابا تجارت کے لیے دُور گئے ہوئے ہیں جب وہ بہت سے رُوپے کما کر آئیں گے تب تمھاری سال گرہ ہو گی۔"

"لیکن امی، ابّو میرے لیے کھلونے اور کپڑے کیوں نہیں بھیجتے۔ میرا جُوتا دیکھیے، بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ کل اِتنا بڑا کانٹا چُبھ گیا تھا اور ڈھیر سارا خُون بھی بہا تھا۔ وہ جو رحیلہ ہے نا، اُس کے ابّو باہر گئے تھے تو ہر مہینے اُس کے اور اُس کی امی کے لیے تحفے بھیجا کرتے تھے،" رضیہ نے مچل کر کہا۔

امی نے کہا "اب تم سکول کا کام کرو۔ تمھارے ابا اب کے تمھاری سال گرہ پر ضرور تحفے بھیجیں گے۔"

"کب ہے میری سال گرہ؟" وہ بے قراری سے بولی۔ بے دھیانی میں اُس کی امی کے مُنھ سے نِکل گیا "12 تاریخ کو۔"

"اچھا تو فرحانہ کی سال گرہ سے دو دن پہلے میری سال گرہ ہے۔ میں فرحانہ کو جا کر بتاتی ہُوں،" یہ کہ کر وہ دوڑی دوڑی گئی اور فرحانہ کو بتا آئی۔ فرحانہ کا دِل چاہا کہ اپنی ساری گُڑیاں، کپڑے اور موتیوں والا سویٹر رضیہ کو دے دے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ رضیہ کی امی بڑی خود دار ہیں۔ وہ ہرگز نہیں لیں گی اُس نے بہت سوچا مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر اُس نے اپنی باجی سے مشورہ کیا۔ باجی جو اُسی کی طرح رحم دِل تھیں، سوچ کر بولیں "تم فکر نہ کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

تین دن گُزر گئے مگر رضیہ کی امی نہ تو فراک ہی بنا سکیں اور نہ فرحانہ کو دینے کے لیے تحفے کا بندوبست کر سکیں۔ فکر کے مارے اُن کا بُرا حال تھا۔ وہ رہ رہ کر خدا سے دُعا کر رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ بارہ تاریخ کو رضیہ کیا جواب دیں گی۔

گیارہ تاریخ کو شام کے وقت رضیہ کھیل میں مشغول تھی اور اُس کی امی پڑوس میں سلائی کے کپڑے لینے گئی تھیں۔ وہ واپس آئیں تو رضیہ کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ رضیہ خوشی سے بے قابُو ہو کر بولی "امی، دیکھیے ابھی ایک آدمی یہ تحفہ دے گیا ہے کہتا تھا تمھارے ابّو نے بھیجا ہے۔"

امی نے حیران ہو کر پیکٹ کھول کر دیکھا تو اُس میں سے ایک نہایت خوب صُورت پھُول دار ریشمی فراک، سُرخ ربن، سُرخ اُون کا موتیوں والا سویٹر، سو رُوپے کا نوٹ اور دو خوب صُورت گُڑیاں نِکلیں۔ رضیہ خوشی سے ناچ رہی تھی لیکن اُس کی امی حیرت کی تصویر بنی اس معمّے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

فرحانہ کی سال گرہ سے پہلے رضیہ کی سال گرہ ہُوئی۔ فرحانہ اور اُس کی باجی کے علاوہ دو چار سہیلیاں اور بھی آئی تھیں۔ رضیہ کی امی نے چائے کے ساتھ دو چار چیزیں اور بنالی تھیں۔ فرحانہ کی باجی نے سال گرہ کے گانے سُنائے اور دونوں نے رضیہ کو تحفے بھی دیے۔ رضیہ اور اُس کی امی کو خوش دیکھ کر فرحانہ اور اُس کی باجی کو بے پناہ مسرّت ہو رہی تھی۔

(تیسرا انعام : 40 رُوپے کی کتابیں)

4

مسرّت رانا۔ ریلوے کالونی خانیوال

دو دِن بعد وقاص کے ابّو کی سال گرہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے ابّو کو کون سا تحفہ دے۔ اُس کے پاس کافی پیسے تھے جو اُس نے اپنے جیب خرچ سے بچا کر رکھے ہُوئے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے اُس نے پیسے گن کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیے تاکہ صُبح سکول جاتے ہُوئے لے جائے اور واپسی پر ایک اچھا سا تحفہ لے آئے۔

سکول سے آتے ہُوئے وہ مارکیٹ گیا تاکہ کتابوں کی دُکان سے کوئی اچھی سی کتاب خرید لے۔ لیکن کوئی کتاب اُسے پسند نہ آئی۔ اِس لیے وہ واپس آگیا۔ ویسے بھی ابھی ایک دن باقی تھا۔ اُس نے سوچا کل جا کر خرید لوں گا۔

گھر واپس آ کر اُس نے کھانا کھایا، سکول کا کام کیا اور پھر کھیلنے چلا گیا۔ شام کو اُس نے ٹیلی وژن کھولا تو اُس میں اُن لوگوں کو دِکھایا جا رہا تھا، جن کے گھر بار اور کھیت کھلیان سیلاب میں تباہ ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس نہ تو پہننے کو کوئی کپڑا تھا اور نہ اوڑھنے کو کوئی کمبل۔ سر چھُپانے تک کو جگہ نہ تھی۔

وہ غریب کھُلے میدان میں پڑے تھے اور سردیوں کے دن قریب آرہے تھے۔ ان لوگوں میں وقاص کی عمر کے بچّے بھی تھے۔

کُچھ دیر بعد اُس کی امّی نے اُسے رات کا کھانا کھانے کے لیے بُلا لیا، اور وہ ٹی وی بند کر کے کھانا کھانے چلا گیا۔ کھانا کھاتے ہُوئے بھی اُسے اُن بچّوں کا خیال آ رہا تھا جن کے پاس کھانے کے لیے کُچھ نہ تھا۔ اُس کی امّی نے جب اُسے سوچوں میں گُم دیکھا تو پُوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟" وقاص نے کہا "کُچھ بھی نہیں۔" امّی نے کہا "جاؤ۔ جا کر سو جاؤ۔ صبح سکول جانا ہے۔"

سونے سے پہلے اُس نے سوچا کہ وہ تمام پیسے سیلاب زدگان کے امدادی فنڈ میں دے دے گا اور امّی اور ابّو سے بھی کہے گا کہ وہ بھی اُن کی دل کھول کر مدد کریں۔ چُناں چہ دُوسرے دن صُبح کو اُس نے اپنے تمام پیسے سیلاب زدگان کے فنڈ میں جمع کروا دیے۔ یہ کام کر کے اُس کا دل بہُت خوش ہُوا۔ رات کے کھانے پر اُس کے ابّو نے پُوچھا کہ بیٹے تم مجُھے کون سا تحفہ دوگے تو وقاص نے کہا "میں نے جو رُوپے تحفے کے لیے رکھے تھے وہ سیلاب زدگان کے فنڈ میں دے دیئے ہیں۔" یہ سُن کر ابّو بہُت خوش ہُوئے۔ اُنھوں نے کہا "تمھارا یہ جذبہ کسی بھی انمول تحفے سے کم نہیں ہے۔"

(چوتھا انعام: 30 روپے کی کتابیں)

5

زاہد زیاد عسکری۔ گوجرانوالہ

میں اپنے دوست حامد کو اُس کی سال گرہ پر کوئی نرالا تحفہ دینا چاہتا تھا۔ ایسا تحفہ جو سال گرہ پر موجود تمام بچّوں کو پسند آئے۔ میں مشورے کے لیے بھائی جان کے پاس گیا تو اُنھوں نے پیار سے بہلاتے ہُوئے کہا "میں حامد کے لیے کوئی خُوب صُورت سا کھلونا لے آؤں گا۔"

لیکن بھائی جان کی یہ تجویز مجُھے پسند نہ آئی کیوں کہ حامد کے پاس پہلے ہی بہُت سے کھلونے تھے اور میں اُسے کوئی نرالا تحفہ دینا چاہتا تھا۔ میں نے بھائی جان کو کھلونا لانے سے منع کر دیا۔

اب میں نے سوچنا شروع کیا کہ تحفہ کس قسم کا ہونا چاہیے۔ پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ تحفہ ایسا ہو جس سے حامد ہمیشہ فائدہ اُٹھاتا رہے۔ دُوسرا خیال یہ تھا کہ تحفہ کوئی کتاب ہو اور اُس میں دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں، سائنسی معلومات، نظمیں اور کھیل کے مُتعلّق معلومات ہوں۔ یہ خیال آنا تھا کہ میرا خیال فوراً تعلیم و تربیت کی طرف گیا اب میں مُطمئن تھا کیوں کہ میں نے حامد کے لیے نرالا تحفہ تلاش کر لیا تھا۔

سال گرہ کا دِن آیا تو میں نے نومبر 88 کے تعلیم و تربیت کو سبز رنگ کے پیکٹ میں بند کیا اور حامد کے گھر جا کر تحفوں والی میز پر رکھ دیا۔ کیک کاٹنے کے بعد حامد نے پیکٹ کھولے تو تعلیم و تربیت دیکھ کر بہُت خوش ہُوا اور اِتنا اچھا تحفہ دینے پر میرا شکریہ ادا کیا۔

اب حامد بھی تعلیم و تربیت ہر ماہ خرید کر پڑھتا ہے اور اِس سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔

(پانچواں انعام: 25 روپے کی کتابیں)

اِن بچّوں کی کوشش بھی تعریف کے قابل ہے۔ انھیں 15، 15 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں:

ذوالفقار احمد فوقی کھلابٹ ٹاؤن شپ ہری پُور ہزارہ۔ نگینہ جمال آفریدی رُلم باغ (مردان)۔ محمد رضوان سرائے صالح۔ نسرین بانو ٹامیوالی۔ عامر بن یعقوب گلشن اقبال کراچی۔ وقاص الحق کراچی یونیورسٹی اسٹاف ٹاؤن۔ ناصر نعیم شاہ فیصل کالونی کراچی۔ مرزا آصف گاڑی کھاتہ حیدر آباد۔ خیر محمد کورنگی کراچی۔ محمد رضوان اورنگی ٹاؤن کراچی۔ خالدہ ڈار ڈرگ کالونی کراچی۔ ناہید جمیل ماڈل کالونی کراچی۔ محمد عاقل احمد خان شاہی بازار پُرانا سکھر۔ سیّدہ شاہ بانو گلشن اقبال کراچی۔ راجا محمود عباسیہ کالونی حیدر آباد۔ بابر صدّیقی گُلفشاں کراچی۔ محمد عاصم بشیر فیڈرل ایریا کراچی۔ سعدیہ آفتاب خواجہ تلہ گنگ۔ شکیل احمد پی او ایف واہ چھاؤنی۔ سُنبل حمید گلشن راوی لاہور۔ نسیم فردوس فرید ٹاؤن ساہیوال۔ محمد شیراز فراز غلام محمد آباد فیصل آباد۔ زُبیر احمد چیمہ گل گشت کالونی ملتان۔ سرفراز قمر جام پُور ضلع راجن پُور۔ محمد عتیق گوجرانوالہ۔ تنویر احمد بھنڈاری چوک ساہیوال۔ اُمِ نرد جھنگ شہر۔ عقیل احمد گرجاکھ (گوجرانوالہ)۔ نادیہ اختر ربانی کالونی فیصل آباد۔ وقار مصطفیٰ گکھڑ منڈی۔ محمد وسیم بن اشرف میاں چنوں۔ محبّ الحسنین خانیوال۔ عطیہ رحمٰن سپر اکھیالی۔ مونا نازش سمن آباد لاہور۔ شکیل احمد بکرا منڈی راولپنڈی۔ شکیل احمد شالامار ٹاؤن لاہور۔ ثمینہ ظفر اسلام آباد۔ محمد سلیم ملتان روڈ لاہور۔ ثوبیہ ہاشمی بابر چوک فیصل آباد۔ اِحسان اللہ اِسلام آباد۔ رانا احمد حسن پاک پتن۔ عامر شہزاد اسلام آباد۔ شعیب الحسن ملک شادمان کالونی ملتان۔ محمد سُہیل اختر لاہور۔ صائمہ مختار سیٹلائٹ ٹاؤن بہاول پور۔ نصیر احمد وہاڑی۔ آمنہ انوار خان کاہنہ نو۔ قمر عباس جعفر والا (بھکّر)۔ محمد عدنان حبیب تعپ خانہ بازار سیال کوٹ چھاؤنی۔ سائرہ یاسمین جڑانوالہ روڈ فیصل آباد۔

کاغذ کی آپ بیتی

آج سے تقریباً 1500 سال پہلے چین میں ایک بہت بڑا عالم گزرا ہے، جس کا نام فان یہ تھا۔ اُس نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ کاغذ حضرت عیسیٰؑ سے 105 سال پہلے چین کے ایک بادشاہ "ہوتی" کے وزیر "تسائی لُن" نے ایجاد کیا تھا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کاغذ قدیم مصریوں کی ایجاد ہے۔ مصری لوگ ایک خاص قسم کے سرکنڈے (کاہنے) کے گُودے سے کاغذ بنایا کرتے تھے۔ مصری زبان میں اِس سرکنڈے کا نام "پاپِرس" تھا۔ (انگریزی لفظ "پیپر" اِسی پاپِرس سے بنا ہے۔) مصر سے کاغذ سازی کا فن چینیوں نے سیکھا اور چینیوں سے دُنیا کے دُوسرے لوگوں نے۔ دسویں صدی عیسوی میں یہ فن یورپ میں گیا اور سپین کے لوگ لکھنے کے لیے کاغذ استعمال کرنے لگے۔ اُس زمانے میں سپین پر عربوں کی حکومت تھی اور عرب اِس ملک کو اندلس کہتے تھے۔

اب تک کاغذ صرف لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، لیکن جب یورپ میں کاغذ سازی کے کارخانے لگے تو اس سے دُوسری چیزیں بھی بنائی جانے لگیں۔ 1465 میں جاذب یا سیاہی چُوس (بلاٹنگ پیپر) بنایا گیا اور اِسی سال دیواروں پر لگایا جانے والا کاغذ (وال پیپر) بنا۔ دُنیا میں سویڈن پہلا ملک ہے جس نے کاغذ کے کرنسی نوٹ چھاپے۔ اِس کے بعد دُوسرے ملکوں میں نوٹوں کا رواج ہُوا۔

فاؤنٹن پن پر کیا گزری

آج سے تقریباً تین سو سال پہلے پیرس کے ایک شخص نے چاندی کا ایک قلم بنایا۔ یہ ایک نلکی تھی جس کے سِرے پر نب لگی ہُوئی تھی۔ اِس میں روشنائی بھر کے اُوپر کارک لگا دیا جاتا تھا۔ یہ دُنیا کا پہلا فاؤنٹن پن تھا۔ 1832 میں ایک انگریز نے اِس پر کیپ (ٹوپی) لگا دی تاکہ اِسے جیب میں رکھا جا سکے۔ 1859 میں ایک اور شخص نے نلکی کے اندر ربڑ کی ٹیوب لگا دی جس میں روشنائی بھری جاتی تھی۔

یہ فاؤنٹن پن لکھتے تو تھے، لیکن خرابی یہ تھی کہ روشنائی کا بہاؤ یکساں نہ ہوتا تھا اور لکھائی کہیں ہلکی اور کہیں گہری ہوتی تھی۔ بعض وقت فاؤنٹن پن ایک دم بہت سی روشنائی چھوڑ دیتا اور سارا کاغذ خراب ہو جاتا تھا۔

یہ فاؤنٹن پن جو آج کل ہم استعمال کرتے ہیں، امریکا کے ایک شخص واٹرمین کی ایجاد ہے۔ واٹرمین ایک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ تھا۔ اُس نے ایک کروڑ پتی سیٹھ کو بیمہ کرانے پر راضی کیا، لیکن جب کاغذ پر دستخط کرنے لگا تو اُس کے فاؤنٹن پن نے روشنائی چھوڑ دی جس سے کاغذ خراب ہو گیا۔ اِس پر سیٹھ صاحب اِتنے ناراض ہُوئے کہ اُنھوں نے بیمہ کرانے سے انکار کر دیا۔ اُس وقت واٹرمین نے عہد کیا کہ میں ایک ایسا فاؤنٹن پن بناؤں گا، جو روشنائی نہ چھوڑے۔ آخر 1884 میں وہ ایسا فاؤنٹن پن بنانے میں کامیاب ہو گیا، جس میں ہوا اور روشنائی بیک وقت مخالف سمتوں میں چلتی تھیں اور قلم روشنائی نہیں چھوڑتا تھا۔ جب سے اب تک فاؤنٹن پن کی شکل و صُورت میں تو تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن سسٹم یا طریقہ واٹرمین ہی کا برتا جاتا ہے۔

پنسل پر کیا بیتی

دُنیا کی پہلی پنسل آج سے تقریباً چار سو سال پہلے سوئٹزرلینڈ میں استعمال کی گئی۔ یہ سُرمے یا سیسے کا ایک ٹکڑا تھا جس سے لوگ لکیریں کھینچتے یا نشان لگاتے تھے۔ 1584 میں انگلستان میں گریفائٹ (پنسل کا سُرمہ) کی کان دریافت ہُوئی تو اِس طرح کی پنسلیں بازاروں میں عام بکنے لگیں۔ لوگ اِن پر کپڑا یا دھاگا لپیٹ لیتے تھے تاکہ ہاتھ خراب نہ ہوں۔

1686 میں پہلی دفعہ ایسی پنسلیں بنیں جن پر لکڑی کا خول چڑھا ہوتا تھا۔ کچھ عرصے بعد لوگوں نے سوچا کہ اگر کان میں گریفائٹ ختم ہو گئی تو کیا ہو گا؟ آخر 1795 میں اُنھوں نے گریفائٹ اور چکنی مٹّی کے آمیزے سے پنسل بنائی جو بہت پسند کی گئی۔ 1858 میں امریکا کے ایک شخص ہائمن لِپ مَین نے پنسلوں کے سِرے پر ربڑ لگانا شروع کی تاکہ ضرورت کے وقت لکھے ہُوئے کو مٹایا جا سکے۔ امریکا ہی کے ایک شخص کلارک نے 1866 میں ایسی پنسل ایجاد کی جس کا لکھا ہُوا ربڑ سے نہیں مِٹ سکتا۔ اِسے کاپِنگ پنسل کہتے ہیں۔ 1877 تک تمام پنسلوں کے سِکّے چوکور یا چپٹے ہوتے تھے۔ پنسلوں میں گول سکّہ لگانے کا رواج اِسی سال ہُوا۔ پنسلوں کے بارے میں عجیب بات یہ ہے کہ اِن کی لمبائی عموماً ایک سی ہوتی ہے، یعنی سات انچ۔

پُرانے زمانے میں، جب قلم ایجاد نہیں ہُوا تھا، لوگ سرکنڈوں (کاہنوں) سے لکھتے تھے۔ روم میں اِنھیں PENICILLUS کہا جاتا تھا جس کا مطلب ہے، چھوٹی سی دُم۔ انگریزی لفظ PENCIL اِسی لفظ سے بنایا گیا ہے۔ (س-ل)

پنسل ہولڈر
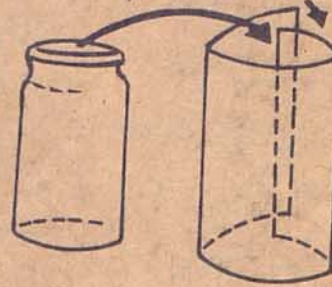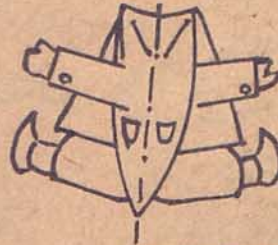
کارڈ بورڈ، قینچی، گوند اور پینٹس لیجیے اور
ان خاکوں کی مدد سے پنسل ہولڈر بنائیے۔
رائٹنگ ٹیبل پر بہت خوب صورت لگے گا۔

آپ کا خط ملا
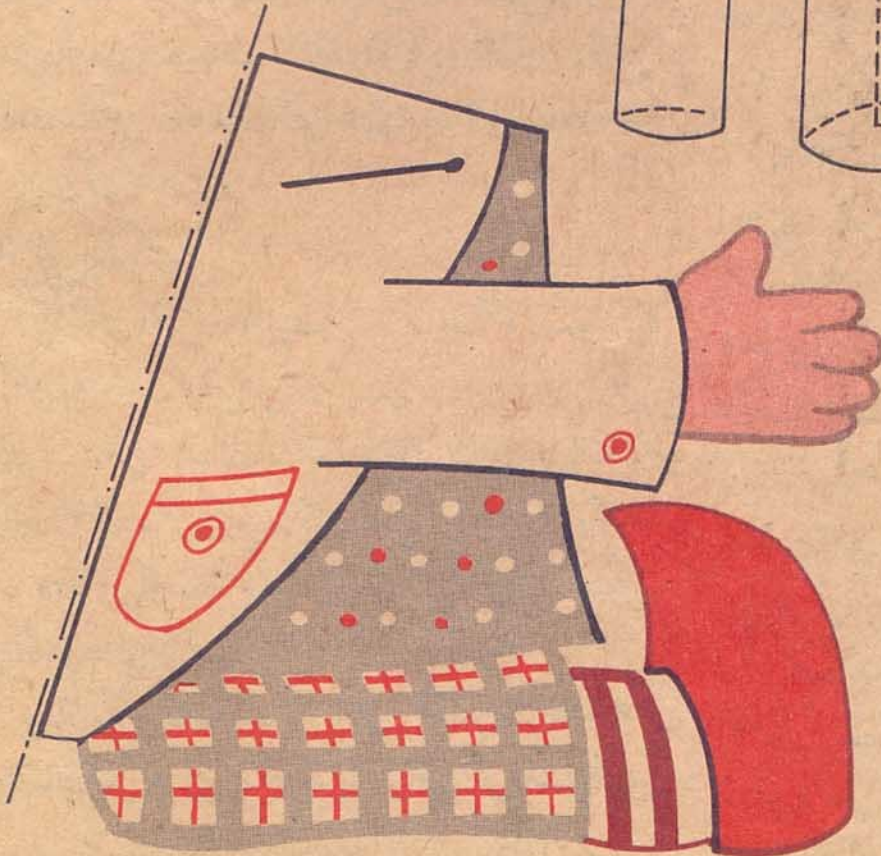
ماہِ دسمبر کے خطوط کے ساتھ آپ کی باجی حاضر ہے ساتھیو !

سب سے پہلے ایک ضروری بات۔ بار بار لکھنے کے باوجود ساتھی ہماری بات پر کان نہیں دھرتے۔ اب بھی بہت سے لفافے ایسے موصول ہوتے ہیں جن پر کسی تحریر کا کوئی عنوان نہیں ہوتا۔ بہت سے خطوط اور تحریریں ایسی ہوتی ہیں جن کے اُوپر نام اور پتا درج نہیں ہوتا۔ ایک ساتھی نے "ساتواں خط" لکھا ہے۔ کہانی کے ساتھ، لیکن نہ تو خط پر نام ہے اور نہ ہی کہانی پر۔ اِس ماہ کے خطوط دیکھنے سے پہلے اُن ساتھیوں کے نام حاضر ہیں جو پچھلے ماہ دیر سے محفل میں آئے یعنی اشفع قصور، حبیب الرحمٰن خاں فیصل آباد، مصباح مبین جلیانوالہ، محمد اسرار غم گین تخت بھائی، ضیاء اللہ خاں نریاب، صائمہ سلیم راولپنڈی، غلام حسین چمن حیدر آباد، عدنان سیالکوٹ، محمد رضوان کراچی، ہارون احمد جہلم۔

تو آئیے ساتھیو اس ماہ کے خطوط کی طرف۔ سب سے پہلا خط اس ماہ منڈی بہاءُ الدین سے محمد ادریس قریشی کا ہے۔ لکھتے ہیں، سرورق پر قائداعظم کی تصویر پسند آئی اور اداریے میں ہونہار مصوّر کا پڑھ کے خوشی ہُوئی کیا تصدیق نامہ ضروری ہے۔ تین چور ایک بے وقوف، ہاتھی میرا ساتھی، پرنالہ وہیں رہا، اللہ دیکھ رہا ہے پسند آئیں۔ بھیا ادریس، تصدیق نامہ ضروری نہ ہوتا تو ہم لکھتے کیوں۔ دُوسرے ساتھی ہیں رحیم یار خاں سے طارق محمود، انھوں نے لکھا ہے، چاہے قیمت بڑھا دیں مگر صفحات میں اضافہ کر دیں۔ بچّوں کا ہر رسالہ پڑھا ہے مگر تعلیم و تربیت کی بات ہی اور ہے۔ بہاول پور سے طارق مختار لکھتے ہیں۔ مجھے تعلیم و تربیت میں لکھنے کا شوق اپنے بھائی فیصل مختار سے ہُوا جس نے انعام حاصل کیا ہے۔ پُراسرار نقاب پوش اور ٹیپو سلطان پسند آ رہی ہیں۔ سلیم نے جگہ کا نام نہیں لکھا۔ لکھتے ہیں، ہاتھی میرا ساتھی، کشتی اُلٹ گئی، بچپن کے دن، سانپ اُس کے پیچھے لگا تھا، رسالے کی رونق تھیں۔ لیجیے فیصل مختار بھی بہاول پور سے آ گئے۔ انھوں نے لکھا ہے اِس ماہ سرورق بہت خُوب صُورت لگا کہ اِس پر ہمارے قائد کی تصویر تھی۔ پُراسرار نقاب پوش اِس ماہ بھی نمبر لے گیا۔ عامر یعقوب کراچی لکھتے ہیں جب سے تعلیم و تربیت کا سائز بڑا ہُوا ہے بہت اچھا لگتا ہے۔ دسمبر کا شمارہ پڑھا، قائداعظم کی تصویر بڑا اچھی لگی، تین چور ایک بے وقوف، ہاتھی میرا ساتھی، بچپن کے دن اور ہمارا وطن پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہُوا۔ محمد ارشاد اللہ کوہلی نے لکھا ہے تعلیم و تربیت پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو، پُراسرار نقاب پوش بازی جیت گیا، یہ کہانیاں بھی پسند آئیں، تین چور ایک بے وقوف، پرنالہ وہیں رہا، اللہ دیکھ رہا ہے، کھلونے یہیں رکھ دو، کشتی اُلٹ گئی، بے وقوف کوّا، بچپن کے دن۔ شہباز احمد کامونکے لکھتے ہیں دسمبر کا شمارہ پڑھا سلسلے وار کامک اور تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں لیکن ہاتھی میرا ساتھی، وائلڈ لائف، پُراسرار نقاب پوش اور کشتی اُلٹ گئی بہت ہی اچھی لگیں۔ گرجاکھ گوجرانوالہ سے زاہد زیاد عسکری نے لکھا ہے، سیلاب آگیا کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔ اِس کے علاوہ سچّی بات، نیل گلے اور ٹیپو سلطان بہت مزہ دے رہی ہے۔ اِسی شہر سے کرن اشرف اور سنبل اشرف نے لکھا ہے۔ تین چور ایک بے وقوف، اللہ دیکھ رہا ہے اور کھلونے یہیں رکھ دو۔ سب پسند آئیں۔ مونا نازش لاہور لکھتی ہیں۔ دسمبر کا سرورق شان دار تھا۔ تین چور ایک بے وقوف، کھلونے یہیں رکھ دو، اللہ دیکھ رہا ہے، کشتی اُلٹ گئی، بے وقوف کوّا اچھی کہانیاں تھیں۔ میاں چنّوں سے وسیم بن اشرف لکھتے ہیں۔ دسمبر کے دو شمارے خریدے ایک ریکارڈ میں رکھ لیا اور دُوسرے کا ورق فریم کروا کے اپنے کمرے میں لگا لیا۔ بھیا وسیم آپ نے پسینے کی بُو کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہ نقل کیوں کی تھی آپ نے ؟ انجم مبین ڈیرہ اسمٰعیل لکھتے ہیں، تین چور ......، ہاتھی میرا ساتھی اور کشتی اُلٹ گئی دِل چسپ تھیں۔ اللہ دیکھ رہا ہے ہم پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ تصدیق نامہ ضروری قرار نہ دیں۔ بھیا انجم، بہن شازیہ جمیل اور بھائی اسمٰعیل عبدالرحمٰن کراچی۔ تصدیق نامہ اس لیے ضروری ہے کہ بچّے تصویر کہیں اور سے ٹریس کر کے نہ بھیجیں۔ اگر آپ نے خود تصویر بنائی ہے اور آپ اسکول یا کالج کے بجائے پرائیویٹ طالب علم ہیں تو اپنے ابّو سے تصدیق کروا کے بھیج دیں۔ روبینہ ناز چیچہ وطنی، اچھی روبی یہ غلط ہے کہ وہ کہانیاں بڑوں نے لکھی ہوتی ہیں، دیکھیے آخر بچّوں کی کہانیوں کا بھی تو معیار ہوتا ہے۔ آپ لکھتی رہیے کام یاب ہوں گی۔ سیّد محمد علی شیرازی اور سیّدہ انصر زُہرہ شیرازی، بہت بڑی کہانیاں بھی مقابلے میں شامل نہیں ہوتیں اور الفاظ اگر آپ کے زیادہ ہیں تو ممکن ہے بامعنی نہ ہوں۔ نسرین بانو خیر پُور ٹامیوالی۔ اچھی نسرین حوصلہ نہ ہاریں، آپ بھی اور آپ کے بھائی جان بھی۔ محنت کریں گے تو ایک نہ ایک دن ضرور کام یاب ہوں گے۔ زراعت حسین جہلم۔ بھیا زراعت ہم معذرت خواہ ہیں کورے صفحات کے لیے آپ بشیر راہی صاحب کو خط لکھ کر دُوسرا پرچہ منگوا سکتے ہیں۔ صائمہ کرن رانا خانیوال نے لکھا ہے راشد بن یعقوب کی کہانی سیلاب آگیا نقل شدہ ہے۔ نونہال میں شائع ہو چکی ہے، عُمر عنایت لاہور۔ بھیا عُمر پچھلے شمارے اُٹھا کر دیکھیں تو آپ کو علم ہو گا کہ کتنے پہلے خطوط کے جواب ہم دے چکے ہیں۔ تعریف اور خوشامد میں فرق ہوتا ہے۔ آپ ہمارے دیے ہُوئے موضوعات پر کہانیاں لکھیں۔ شاہد فیروز گوجرانوالہ۔ بھیا شاہد، مقبُول جہاں گیر کا انتقال ہو چُکا ہے۔ قدسیہ یاسمین بھکر۔ اچھی بہن ایسے پیار بھرے خط اور دعاؤں کا شکریہ۔ بھائی جان کی طرف سے جوابی سلام

اور دُعائیں۔ عظمیٰ نورین راولپنڈی۔ عظمیٰ جی آپ ضرور آئیں اور ہم سے ملیں۔ سعید لخت صاحب کو آپ کا پیغام دے دیا ہے۔ محمد سہیل اختر اسلام آباد۔ ایک لائن چھوڑنے کی شرط تو ہم نے کبھی نہیں لگائی، ایک صفحہ چھوڑنا ہی کافی ہے۔ صائمہ سلیم راولپنڈی، چوہدری خادم حسین گولٹن، ہمارے دیے ہُوئے موضوعات پر کہانی لکھیں۔ عامر شہزاد مدرسہ چٹھہ، سب سے پہلے تو بھیا اپنا اِملا درست کریں، مزائیہ نہیں مزاحیہ درُست لفظ ہے اور شعاع نہیں شائع لکھا جاتا ہے۔ ضیا محمد عرف ٹائیگر پشاور۔ بھیا آپ اب بڑے ہو گئے ہیں قلمی دوستی میں چھوٹے بھائی کا ہی تعارف بھیجیں۔ محمد منیر اسلام آباد، بھیا آپ رسالے سے متعلق بشیر راہی صاحب کو دُوسرے پتے پر خط لکھیں۔ ذی شان حیدر چشتیاں، آپ نے کہانی ۱۴ تاریخ کو لکھی ہے بھیا جب کہ آخری تاریخ ہے۔ آصف رضا لوتی، بھیا آپ کی تجاویز پر غور کریں گے۔ فاطمہ صادق آباد رحیم یار خاں۔ اچھی بہن آپ ہمارے دیے ہُوئے موضوعات پر کہانی لکھیے۔ عامر اقبال ملتان۔ بھیا عامر ہم ہر ماہ موضوعات دیتے ہیں آپ ان پر کہانی لکھیں۔ محمد زاہد پیلاں۔ ثاقب حسین زیدی لاہور۔ بھیا ناراض نہ ہوں۔ الفاظ با معنی لکھا کریں۔ اور سوالوں کے لیے آپ بھی پوچھیے کے عنوان سے خط لکھیں۔ راجہ راشد بشیر کراچی۔ جو بھی لکھنا ہو پُورے صفحے پر لکھیں پُرزے بعض اوقات بے شمار ڈاک کھولتے ہُوئے پھسل کر ردّی کی ٹوکری میں بھی چلے جاتے ہیں اور انھیں دُوسری ڈاک کے ساتھ محفوظ رکھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ واصف عدیل میاں والی، آپ کے ابّو کا خط مِلا بھیا، انعامی کتب بھیجنے میں ایک ماہ کی تاخیر ضرور ہوتی ہے۔ محمد اکرم پکا منا تحصیل لودھراں۔ خوش آمدید بھیا اکرم۔ رسالے کی رائے میں آپ لیٹ ہو گئے۔ ذی شان بن نذیر فیصل آباد۔ بھیا اتنی مایُوسی ٹھیک نہیں۔ دیکھیے آپ کا نام آگیا نا۔ خط پُورا شائع نہیں ہو سکتا آپ لیٹ آئے ہیں۔ محمد رضوان کراچی۔ مظفر اقبال حاجی والا۔ آپ کو انعامی کتابیں مل گئیں بہت خوشی کی بات ہے۔ صائمہ بینا چیچہ وطنی۔ ابھی آپ کا خط ملا اور جواب دے رہے ہیں پتا ٹھیک ہے بینا۔ عباد علی سحر ناز لاہور۔ شکریہ بھیا کہ انعام پاکر آپ کی غلط فہمی دُور ہو گئی کہ ہم صِرف اپنے رشتے داروں کو انعام دیتے ہیں۔ سہیل احمد عباس تخیّل عاقل، بھیا سہیل اِس سے پہلے آپ کا کوئی خط نہیں مِلا۔ محمد اقبال کراچی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے بھیا اقبال۔ منصور حسین جانگڑا کراچی۔ بھیا رسالے کا یہ سائز تو بہت سے ساتھی پسند کر رہے ہیں۔ شاہد جاوید گھمن سیالکوٹ۔ بھیا شاہد اِس ماہ سے ہم قرآنی کہانیوں کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ خاور شاداب بھکر آپ ایک ساتھ سب مقابلوں میں حصّہ لے سکتے ہیں۔

اِن ساتھیوں کے خطوط بھی مِل گئے ہیں۔ لاہور۔ روحینہ عبداللہ، بشریٰ نذیر، افتخار بھٹی، کاشف عمران، ایاز قیصر، محمد مظہر ہاشمی، ملک کامران غوث، شبانہ رفیع، فریدہ شوکت، نسرین اختر، صائمہ حبیب، عبدالعزیز، لوبی رضوانہ یُوسف، مظہر ہاشمی کراچی، کاشف سلیم، شازیہ سحر، محمد حنیف خاں، محمد شاکر۔ راولپنڈی۔ فاروق اعظم، اکرام الحق، فاطمہ مسعود، راجہ صدیق کیانی۔ اسلام آباد۔ مسرور احمد، سیّد کاشف سرار، سمیعہ عنایت اللہ، عاتقہ خضر، صدف عرفان، عطیہ رحمٰن۔ فیصل آباد۔ شبیر حسین، غلام فرید ٹمّی۔ گوجرانوالہ۔ محمد اشرف کوثر، سنبل اشرف، کرن اشرف، اعجاز احمد علی اصغر پڈا۔ سیالکوٹ۔ الحاج شاہد نذیر، ندیم لطیف۔ ملتان۔ شعیب الحسن، فوزیہ قادری، محمد غضنفر خان، عامر اقبال۔ بھاول پُور۔ فیصل مختار، رعنا مختار، نعیم نبی۔ کوکب ارم بھکر، دھنیش کمار نواب شاہ، انجم مبین ڈی جی خان، میمونہ مقصود سیالکوٹ، ریاض محمود پیرزادہ، محمد ادریس قریشی منڈی بہاؤالدین، غلام اللہ بخش تونسہ شریف۔ اللہ دتہ عقیل بتّی لکھا یوالہ۔ محمد احمد جاوید اوکاڑہ۔ طارق محمود موضع نظام پُور۔ محمد اعظم تحصیل پھالیہ۔ رضوان مسعود اصغر چیچہ وطنی، اللہ نواز، سیف اللہ، خلیل الرحمٰن، حاجی پُور، راج کمار نواب شاہ، محمد شفیق، شیراز احمد شیرازی قصور۔ جاوید حسین، نگینہ جمال آفریدی مردان۔ فرحانہ جمیل، عبدالہادی پشاور، فضل ریان کوہاٹ۔ عظمیٰ رشید شیخوپُورہ۔ عمیر احمد کمالیہ۔ شکیل احمد بکرا منڈی۔ خرم حبیب کاموکے۔ راجہ طاہر محمود بستی ملوک۔ شازیہ محمد حسن ملکہ ہانس۔ اخلاق حسین گڈو۔ شمائلہ برلاس ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ عطاءالمحسن طاہر پنڈ دادن خان۔ ہما طارق عارف والا۔ محمودہ سلطانہ، فضل احمد فانی ربوہ۔ جاوید اقبال، زاہد ملک میاں والی۔ ہارون رشید مکڑوال۔ عبدالغنی کوئٹہ۔ محمد ہاشم مسافر حیدر آباد، مختار احمد جھاوریاں۔ مظفر اقبال حاجی والا، زاہد حسین چکوال۔ منزہ جبیں خانیوال۔ جگہ کا نام نہیں لکھا۔ راشد لیاقت، کامران، ناہید میر۔ فرحانہ جمیل، بے نظیر، محمد ارشد، روبینہ جوہر پشاور۔ عدیل احمد، شکیل احمد واہ کینٹ۔ وسیم عباس سیالکوٹ۔ محمد محسن نواب شاہ۔ ثمر عباس جعفر والا۔

آپ کی تحریر کیوں شائع نہیں ہوتی؟

اس لیے کہ آپ ضروری باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔ اگر اپنی تحریر شائع کروانا چاہتے ہیں تو
■ پہلے صفحہ پر عنوان کے ساتھ پُورا نام اور پتا درج کریں۔ ■ صاف ستھرا اور خوش خط لکھیں۔ ■ ایک صفحہ چھوڑ کے لکھیں۔ ■ پنسل سے نہ لکھیں۔ ■ اپنی تمام تحریریں الگ الگ کاغذ پر لکھیں ■ کوپن تصویر یا صفحے کے ساتھ پن اپ کریں۔ بلا عنوان، آپ بھی پُوچھیے، آئیے دوست بنائیں، آئیے مسکرائیں، ساتھی ایک ہی لفافے میں بھیج سکتے ہیں۔ آپ بھی لکھیے (منتظر ہیں) اور آپ کا خط مِلا، ایک لفافے میں اور دلفوں علیحدہ الگ لفافے میں سب لفافوں پر اُن کے شعبوں کا نام لکھ کر ارسال کریں۔ اپنی تحریریں ساتھی اس پتے پر ارسال کر سکتے ہیں۔ ایڈیٹر ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس (ایمپریس) روڈ لاہور۔ رسالے سے متعلق معلومات، اپنے چیک اور ڈرافٹ، رسالہ نہ ملنے کی شکایت اس پتے پر ارسال کریں۔ سرکولیشن مینیجر ماہنامہ تعلیم و تربیت 60 شاہراہ قائد اعظم لاہور

پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں — تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں
دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں — چوتھا انعام: 25 روپے کی کتابیں

امۃُ المبین - شاد باغ لاہور (پہلا انعام)
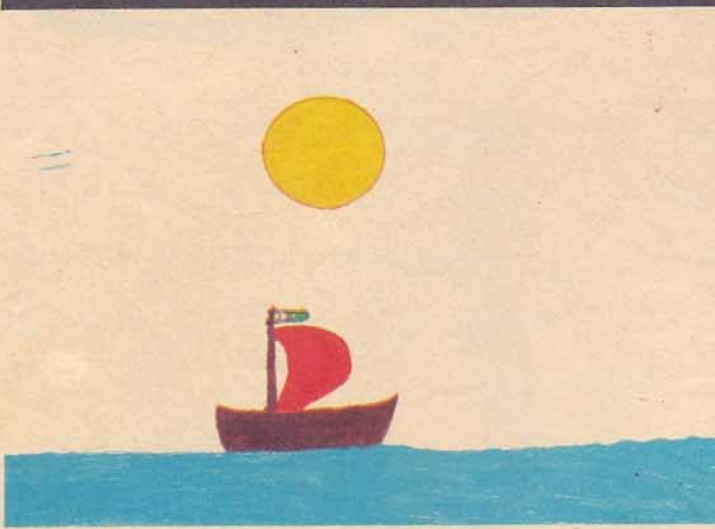
عمران الٰہی - ڈویژنل پبلک سکول لاہور (دوسرا انعام)

شازیہ جمیل - رنچھوڑ لائن کراچی (تیسرا انعام)

احمد علی - منگورہ ضلع سوات (چوتھا انعام)

اِن ہونہار مصوّروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں

ماہ وش صِدّیقی عزالی پارک لاہور - عدیل اسرار اِسلام آباد - عاقل احمد خان شاہی بازار پُرانا سکھّر - وقاص رشید کریسینٹ ماڈل سکول لاہور - صُہیب رشید سمن آباد لاہور - اِسماعیل عبدُالرحمان میٹھادر کراچی - محمّد صبیح انور کریسینٹ ماڈل ہائر سکنڈری سکول لاہور - زاہد ندیم ہاشمی شالامار ٹاؤن لاہور - امجد حُسین نشتر روڈ لاہور - زہرا آفاق جیل روڈ لاہور - محمّد رضوان اورنگی ٹاؤن کراچی - محمّد عُثمان ماڈل ٹاؤن لاہور -

نیچے دو مہینوں کے لیے موضُوع دیے گئے ہیں - آپ جس موضُوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں -

فروری : پہاڑ اور سُورج
(آخری تاریخ 10 جنوری)

مارچ : آسمان پر پرندے

سائنس

فضا کیا ہے

سعید لخت
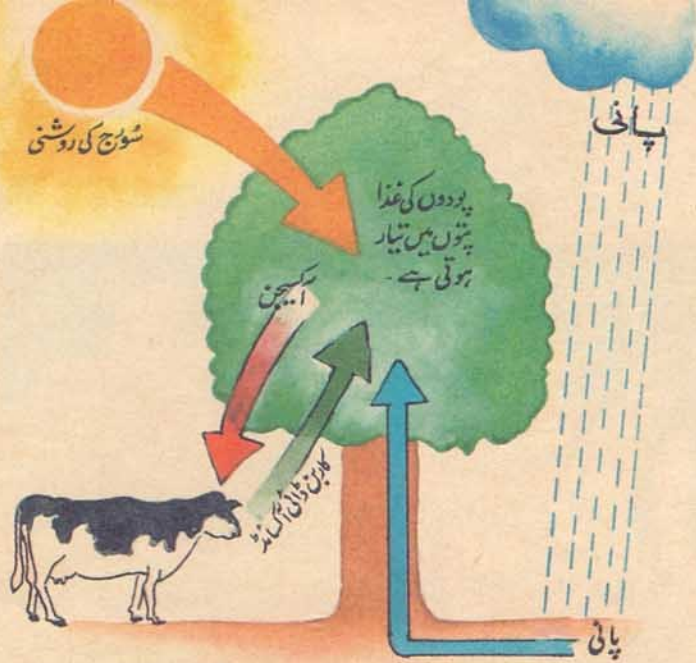
ہم زمین کی سطح پر رہتے ہیں۔ ہمارے اُوپر فضا (ATMOSPHERE) ہے، جسے ہم ہوا کہتے ہیں۔ یہ فضا یا ہوا چند گیسوں کا ایک غلاف ہے جو زمین کے چاروں طرف چڑھا ہُوا ہے۔ اِسے زمین کی کشش زمین سے الگ نہیں ہونے دیتی۔ اِس کی زیادہ مقدار سطحِ زمین سے 16 کلو میٹر کے اندر واقع ہے۔ جُوں جُوں اِس سے اُوپر جائیں گے، اِس کی مقدار کم ہوتی جائے گی اور آخر کار بالکل ختم ہو جائے گی۔

فضا یا ہوا ہماری زمین کو حرارت اور سردی کی شِدّت سے بچاتی اور اُن خطرناک شُعاعوں سے محفوظ رکھتی ہے جو سُورج سے نکلتی ہیں۔ اگر فضا نہ ہوتی تو زمین پر کوئی جان دار نہ ہوتا اور ہماری زمین دِن میں ایک تپتے ہُوئے گولے کی مانند ہوتی اور رات کو برف کی ٹھنڈی یخ سِل کی طرح۔ ہوا میں جو گیسیں پائی جاتی ہیں، وہ زندگی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اِن گیسوں میں نائٹروجن گیس کی مقدار سب سے زیادہ ہے (تقریبًا 78 فی صد) اِس کے بعد آکسیجن گیس کا نمبر ہے (تقریبًا 21 فی صد) اِن کے عِلاوہ آرگن اور کاربن ڈائی آکسائڈ بھی تھوڑی تھوڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔

جب انسان اور دُوسرے حیوان سانس لیتے ہیں تو ہوا کی آکسیجن استعمال کرتے ہیں جو اُن کے جسم میں خرچ ہو جاتی ہے۔ لیکن ہوا میں آکسیجن کی مقدار اُتنی ہی رہتی ہے، کیوں کہ پودے (گھاس اور درخت) اِس خرچ شُدہ آکسیجن کی کمی کو پُورا کر دیتے ہیں۔ سانس لینے کے عمل میں انسان اور حیوان آکسیجن کی کچھ مقدار کو کاربن ڈائی آکسائڈ میں بدلتے ہیں اور پھر اُسے سانس کے ذریعے باہر نکال دیتے ہیں۔ پودے کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور سُورج کی روشنی کی مدد سے اُسے آکسیجن میں بدل کر باہر نکالتے ہیں۔ اِس لیے ہوا ہر دم تازہ اور آکسیجن سے بھرپُور رہتی ہے۔ آکسیجن زندہ رہنے کے لیے ہی نہیں، آگ جلنے کے لیے بھی ضروری ہے۔

ہوا میں گیسوں کے عِلاوہ آبی بُخارات بھی (مُختلف مقدار میں) ہوتے ہیں۔ زمین کی مٹّی بھی، کاربن کے ننھّے ننھّے ذرّوں کی شکل میں موجود ہوتی ہے۔ ٹوٹے ہُوئے شہابیوں (METEORITES) کی راکھ بھی ہوا میں شامل ہو جاتی ہے۔ اِسے کائناتی خاک (COSMIC DUST) کہتے ہیں۔ جب اِن خاکی ذرّوں کے ساتھ آبی بُخارات مِلتے ہیں تو بارش کے قطرے بن جاتے ہیں۔ اور پھر یہ قطرے، بھاری ہو کر، زمین پر گرنے لگتے ہیں۔ سمندروں سے، عملِ تبخیر کے ذریعے، جو پانی ہوا میں شامل ہوتا ہے، اُس کے ساتھ نمک کی تھوڑی سی مقدار بھی اُوپر چلی جاتی ہے اور یہ نمک بھی ہوا میں مِل جاتا ہے۔ (بارش کا پانی ہلکا سا نمکین ہوتا ہے۔)

زمین کی سطح کے قریب کی ہوا، اُوپر کی ہوا کے مُقابلے میں، زیادہ گرم ہوتی ہے، کیوں کہ یہاں اِس پر سُورج سے زیادہ زمین کی گرمی اثر کرتی ہے۔ فضا یا ہوا کا یہ نچلا حصّہ جس میں ہم سانس لیتے ہیں، ٹراپوسفیئر (TROPOSPHERE) کہلاتا ہے۔ یہ زمین سے 10,000 میٹر تک بلند ہے۔ جُوں جُوں آپ فضا میں اُوپر اُٹھتے جائیں گے، ہوا ٹھنڈی ہوتی جائے گی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جمنے کی یہی وجہ ہے۔ زیادہ بلندی پر ہوا ہلکی ہو جاتی ہے اور اِس کا دباؤ بھی کم ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُونچے پہاڑوں پر سانس لینا دُشوار ہوتا ہے۔

ٹراپوسفیئر کے اُوپر ہوا کی ایک اور تہ ہے جسے سٹراٹوسفیئر (STRATO SPHERE) کہتے ہیں۔ ہوا کی یہ تہ تقریبًا 50 کلو میٹر تک اُونچی ہے۔ فضا کا یہ حصّہ بہت سرد ہے (تقریبًا $-50°C$)۔ لیکن یہاں ہوا ساکن رہتی ہے۔ ہوائی جہاز سٹراٹوسفیئر کے نچلے حصّے میں، بادلوں کے اُوپر، پرواز کرتے ہیں۔

سٹراٹوسفیئر کے اُوپر ہوا کی جو تہ ہے اُس میں اوزون (OZONE) گیس پائی جاتی ہے جو آکسیجن گیس سے مِلتی جُلتی ہے۔ اوزون کی یہ تہ ڈھال کا کام کرتی ہے، کیوں کہ یہ سُورج کی خطرناک شُعاعوں کو زمین تک نہیں پہنچنے

دیتی۔ اس کے اُوپر بالائی (اُوپری) فضا ہے۔ یہاں سے ہوا آہستہ آہستہ بہُت ہلکی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ (سطحِ زمین سے 200 کلومیٹر اُوپر) بالکُل ختم ہوجاتی ہے۔ جہاں ہوا ختم ہوتی ہے، وہاں سے بیرُونی خلا (OUTER SPACE) شروع ہوتی ہے اور یہیں خلائی جہاز اور مصنُوعی سیّارے زمین کے گِرد چکّر لگاتے ہیں (خلا اُس بے حد و بے حساب لمبی چوڑی "جگہ" کا نام ہے جس میں ہمارا سورج، اُس کے نو سیّارے، تمام ستارے اور کہکشائیں واقع ہیں)۔

ہوا کی چند خصُوصیّتیں یہ ہیں (1) یہ جگہ گھیرتی ہے (2) اس میں وزن ہوتا ہے (3) دباؤ ہوتا ہے (4) دبانے سے دب جاتی ہے۔ (5) ہر جگہ موجُود ہے (6) گرمی سے پھیلتی اور سردی سے سُکڑتی ہے۔

سطحِ زمین سے اُوپر کی ہوا زمین پر دباؤ ڈالتی ہے۔ یہ دباؤ مُختلف جگہوں پر مُختلف ہوتا ہے اِسے فضائی دباؤ کہتے ہیں۔ سطحِ سمُندر کے پاس فضائی دباؤ تقریبًا ایک کلوگرام فی مُربّع سنٹی میٹر (14.7 پونڈ فی مُربّع انچ یا 1013.2 ملی بار) ہوتا ہے۔ جُوں جُوں زمین سے اُوپر جائیں گے، دباؤ کم ہوتا جائے گا۔ گرم عِلاقوں میں ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہے، کیوں کہ ہوا گرم ہوکر ہلکی ہوجاتی ہے (خطِ استوا ہوا کے کم دباؤ کا علاقہ ہے)۔ سرد عِلاقوں میں دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔ آندھیاں زیادہ دباؤ کے علاقوں سے کم دباؤ کے علاقوں کی طرف چلتی ہیں۔

اب پیالے میں پانچ سنٹی میٹر پانی بھریے۔ پھر موم بتی کو جار سے ڈھانپ دیجیے۔ پیالے کا پانی آکسیجن کی جگہ لینے کے لیے اُوپر چڑھے گا، اور جب تمام آکسیجن ختم ہوجائے گی تو موم بتّی بُجھ جائے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ پانی جار کے صرف پانچویں حصّے تک چڑھا ہے۔

بعض ہوائیں باقاعدہ اور مُستقل چلتی ہیں اور اِن کے مخصُوص نام ہیں اِن میں سے ایک تجارتی ہوائیں ہیں۔ یہ ہوائیں پُرانے زمانے کے تجارتی جہازوں کے لیے بہُت مُفید تھیں، اِس لیے اِن کا نام تجارتی ہوائیں پڑ گیا۔ اُن دِنوں بحری جہاز بادبانوں کی مدد سے چلتے تھے اور اِن ہواؤں کے بغیر حرکت نہ کر سکتے تھے۔

کوہِ ہمالیہ کی چوٹی ایورسٹ دُنیا کی سب سے اُونچی پہاڑی چوٹی ہے (تقریبًا 9000 میٹر بلند) یہاں ہوا کا دباؤ بہُت کم ہے، اس لیے کوہ پیما اس چوٹی پر چڑھنے کے لیے آکسیجن کے سلنڈر ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ آسانی سے سانس لے سکیں۔ بعض کوہ پیما آکسیجن سلنڈر کے بغیر بھی اس چوٹی پر چڑھ چکے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ بلندی پر، آکسیجن کے بغیر، انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ سب سے پہلے، 1953 میں، نیوزی لینڈ کے کوہ پیما ایڈمنڈ ہلیری اور نیپال کے شرپا تن زنگ نے اِس چوٹی کو سر کیا (یعنی اس کے اُوپر پہنچنے میں کام یاب ہُوئے۔)

سُلطان ٹیپو کا جشنِ تاجپوشی
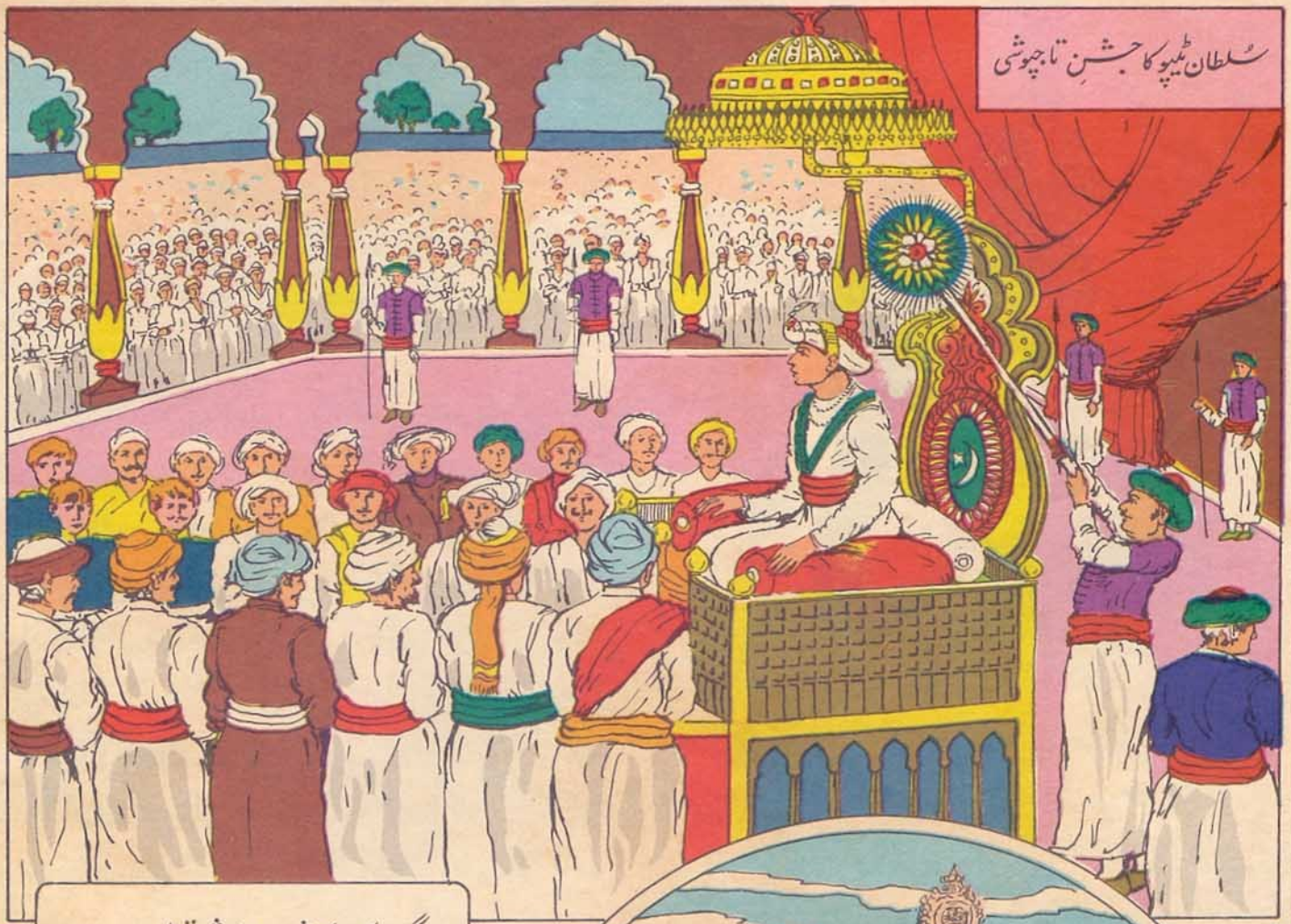
مینگلور میں حملہ کرنے کے بعد برطانوی فوجیں بھاگ رہی ہیں سُلطان ٹیپو کی فوجوں نے "محاصرے" میں لے کر اُنھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا ہے۔
یہ بدنیت انگریز ہمارے داخلی حالات کی نزاکت سے فائدہ اُٹھا کر سُلطان معظم کو خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہیں۔ مگر اب دیکھ لو مار کھا کر کس طرح ہتھیار ڈال رہے ہیں۔
اللہ کا شکر ہے ہم نے حملہ آوروں کو شکست فاش دی اب سُلطان کو ریاست کے عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر پُوری یکسوئی سے دھیان دینے کا موقع ملے گا۔ انشاءاللہ
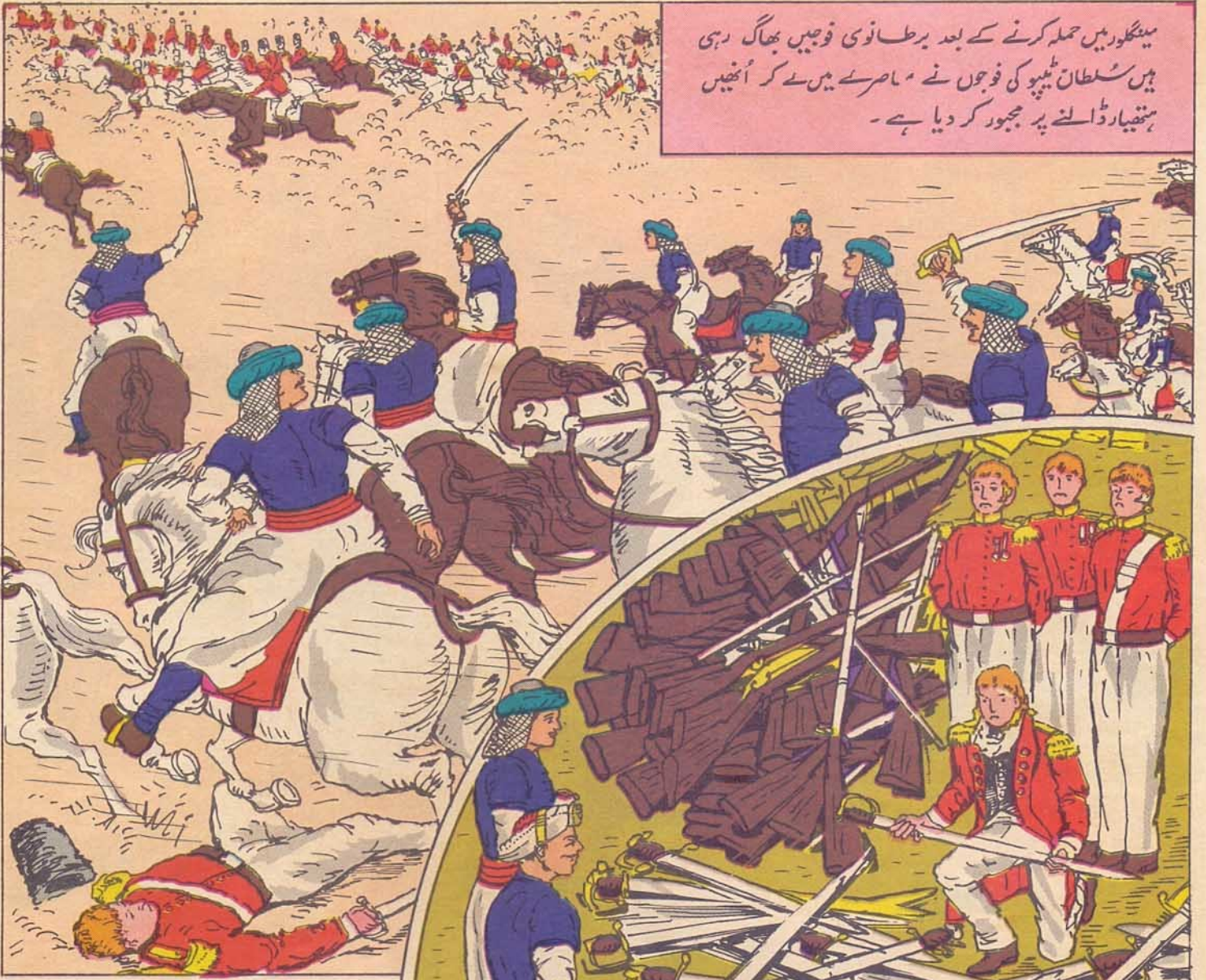
انگریزوں کے نمائندے اور سلطان ٹیپو کے درمیان دربار میں صلح کے مذاکرات
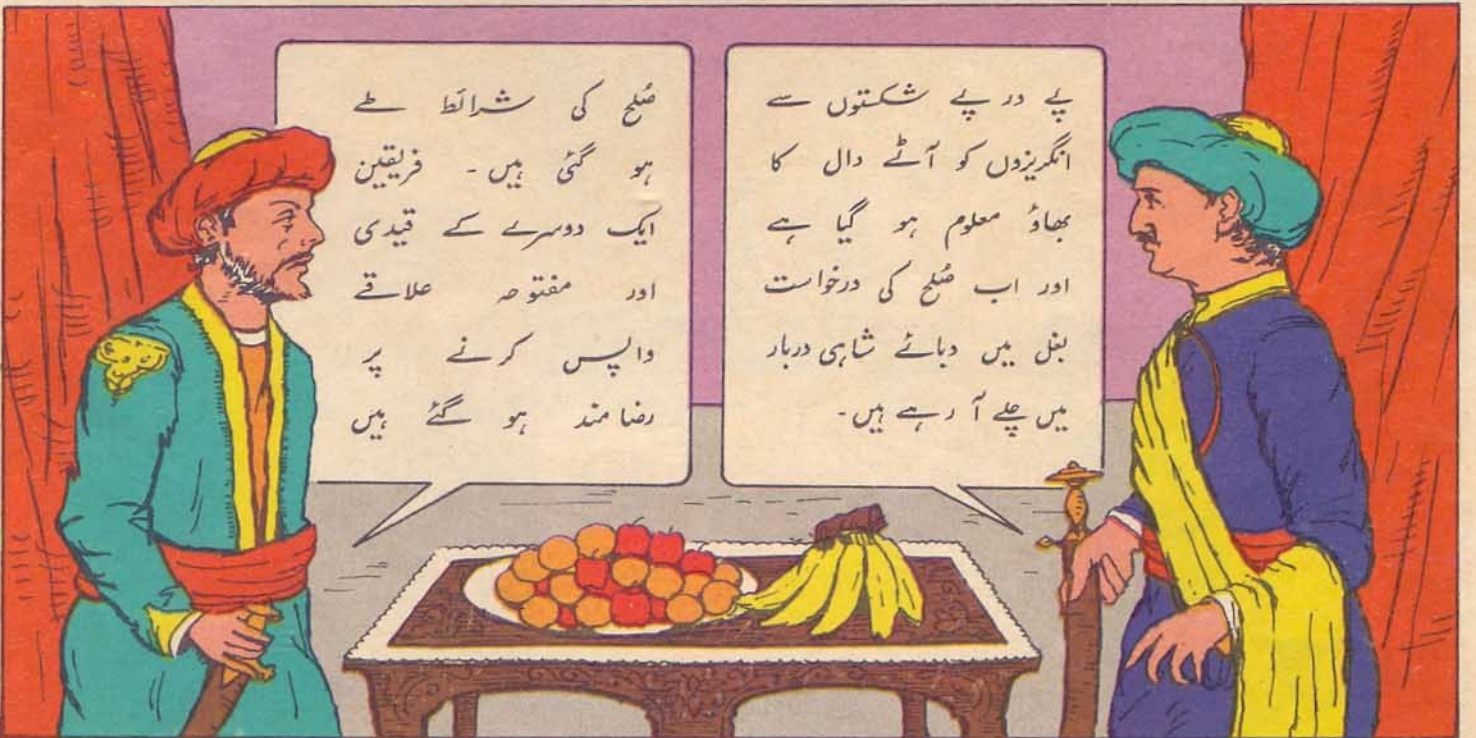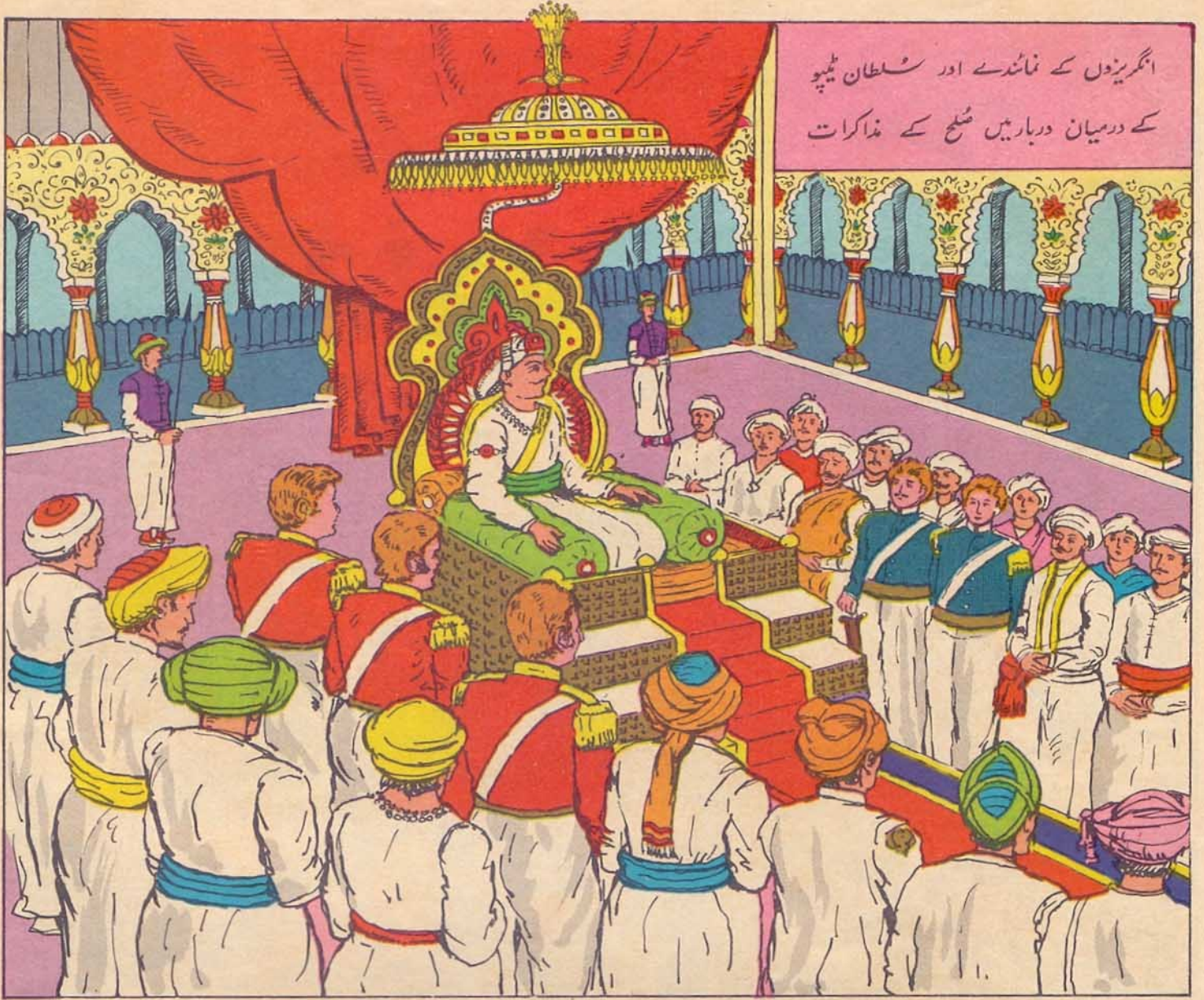
سُلطانِ معظم ! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ مکّار انگریز
صُلح کی شرائط کی کھُلم کھُلا خلاف ورزی پر اُتر آئے
ہیں - ہندو مرہٹوں اور نظام دکن کو پھر سے ہمارے
خلاف بھڑکا رہے ہیں -
سمجھ نہیں آتا -
یہ لوگ اس قدر
بے ضمیر کیوں ہوگئے ہیں -
عالی جاہ ! آپ کی زیرِ سرکردگی
ریاست میسور کی ترقی پر مرہٹے اور نظام
حسد کی آگ میں جلنے لگے ہیں اسلیئے عیّار انگریز
انہیں آسانی سے آلہ کار بنا رہے ہیں -
حالات پر کڑی نگاہ رکھو !
مسلح افواج کو ہنگامی حالات سے نمٹنے کے
لیے چوکس رہنے کا حکم دے دو !
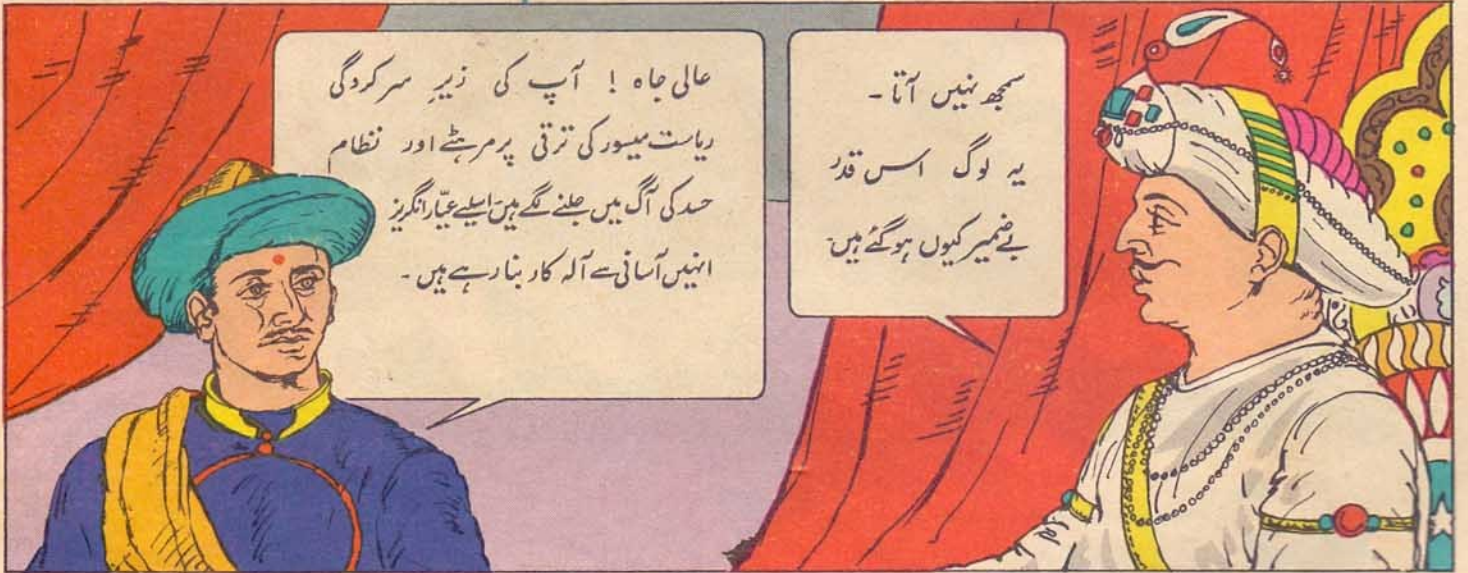
بھیڑیا

جنگلی حیات قومی ورثہ ہے

WWF
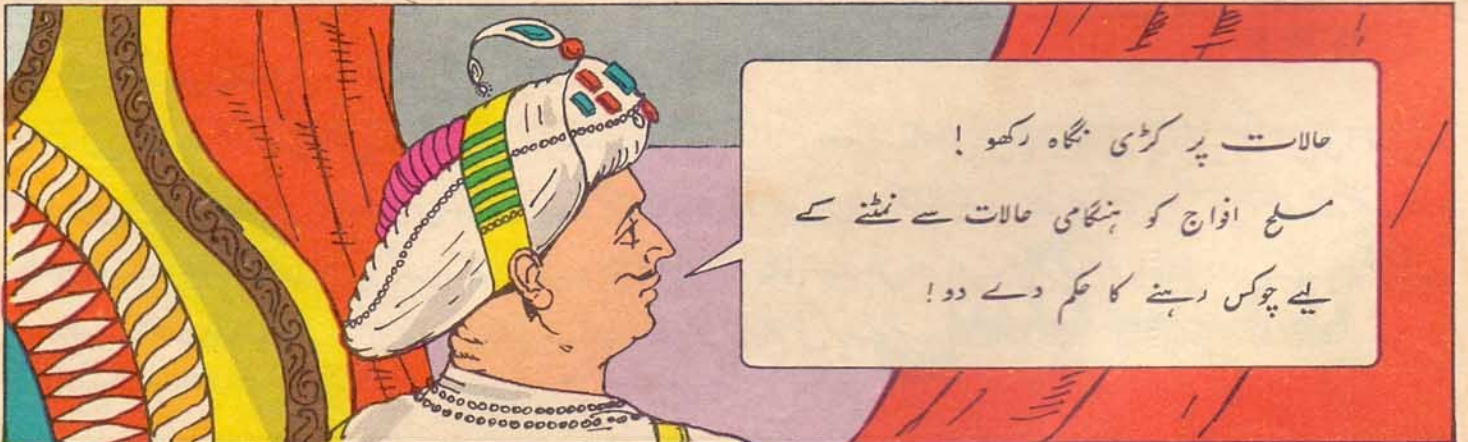
پاکستان کے تمام غیر آباد علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ زیادہ تر رات میں نکلتا ہے۔ خوراک کی تلاش کے لیے میلوں بھاگتا ہے۔ اس کی کھال میں پسینے کے غدود نہیں ہوتے۔ اس لیے یہ ہانپ کر جسم کی حرارت خارج کرتا ہے۔ حملے کے وقت اس کی گردن کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور سر قدرے جھکا ہوتا ہے۔

مادہ ایک جھول میں چار یا پانچ بچے دیتی ہے، جن کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور تقریباً ایک ہفتے بعد کھلتی ہیں۔ ماں آٹھ ہفتے تک دودھ پلاتی ہے۔ ماں اور باپ مل کر بچوں کو پالتے اور ان کے لیے خوراک تلاش کرتے ہیں۔

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

R. L. NO. 4756 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 8.00

تعلیم و تربیت

نیا سال مُبارک 1989

ہر سال جو بھی اچھا کام کریں اُسے نوٹ کرتے جائیں۔ اس طرح آپ کے بہترین کارنامے ریکارڈ ہوتے جائیں گے۔

JANUARY جنوری

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
*	*	1	2	3	4	5
6	7	8	9	10	11	12
13	14	15	16	17	18	19
20	21	22	23	24	25	26
27	28	29	30	31	*	*

FEBRUARY فروری

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
*	*	*	*	*	1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	*	*

MARCH مارچ

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
31	*	*	*	*	1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	29	30

APRIL

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
*	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30	*	*	*	*

MAY

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
*	*	*	1	2	3	4
5	6	7	18	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	*

JUNE

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
30	*	*	*	*	*	1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29

JULY

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
*	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30	31	*	*	*

AUGUST

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
*	*	*	*	1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	31

SEPTEMBER ستمبر

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30	*	*	*	*	*

OCTOBER

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
*	*	1	2	3	4	5
6	7	8	9	10	11	12
13	14	15	16	17	18	19
20	21	22	23	24	25	26
27	28	29	30	31	*	*

NOVEMBER

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
*	*	*	*	*	1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	29	30

DECEMBER

Fri	Sat	Sun	Mon	Tue	Wed	Thu
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30	31	*	*	*	*